✿ تصوف کے چشمہ صافی کو کیسے ایک جوہڑ بنا دیا گیا؟

✿ ارباب تصوف روافض اور سبائیوں کی دسیسہ کاریوں سے کیوں آگاہ نہ ہو سکے؟

✿ تصوف کے اصول و مبادی کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنا کیوں چھوڑ دیا گیا؟

✿ خانقاہیں ایزد پرستی کی درس گاہوں کے بجائے شخصیت پرستی کا مرکز کیسے بن گئیں؟

ان سب سوالوں کے جواب

اور

تصوف کی تاریخ کے حقیقت پسندانہ اور بے لاگ تجزیے کے لئے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

کی معرکۃ الآراء کتاب

''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''

کا مطالعہ کیجئے!

عمدہ کمپیوٹر کمپوزنگ، دیدہ زیب ٹائٹل، صفحات:124، قیمت:-/48 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون:03-5869501

قرآن اکیڈمی

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۱ | ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ - جون ۲۰۰۲ء | شمارہ ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بجری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون: 100 روپے

فی شمارہ: 10 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حرفِ اوّل

عقیدۂ ختم نبوت اور اس کا ہر حملے سے دفاع ہمارے ایمان کا جزو لاینفک ہے۔ اس ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی طرف سے قومی اخبارات کو مندرجہ ذیل بیان برائے اشاعت ارسال کیا گیا۔ یہ اہم بیان بطور ''حرفِ اول'' نذر قارئین ہے:

''حکومت پاکستان کا یہ اعلان کہ ووٹ سازی کے لئے مسلمانوں کے لئے مجوزہ ووٹر فارم میں قادیانیت سے متعلق لازمی حلف نامہ جو کسی وجہ سے ساقط کر دیا گیا تھا بحال کر دیا گیا ہے بہت خوش آئند ہے۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جبکہ بھارت کی ممکنہ جارحیت کے پیش نظر قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی شدید ضرورت ہے حکومت کے اس اقدام نے کسی احتجاجی تحریک کی ضرورت ختم کر کے نہایت دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ بنابریں اس اقدام پر حکومت پاکستان شکریے اور مبارک باد دونوں کی مستحق ہے!

اس ضمن میں جمعیت علماء اسلام (ف) بھی لائق شکریہ و مبارک باد ہے کہ اس نے اس موضوع پر ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کر کے حکومت کو مسئلے کی سنگینی سے خبردار کر دیا اور سب سے بڑھ کر مستحق شکریہ و مبارک باد ہیں عالمی تحفظ ختم نبوت کے درویش رہنما اور کارکن جو ملک میں ہونے والے سیاسی اتار چڑھاؤ' اور اکھیڑ پچھاڑ سے بالکل لاتعلق رہتے ہوئے انسدادِ فتنہ قادیانیت پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کئے ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے خاص طور پر عقیدہ ختم نبوت کی سرحدوں پر ''مرابطین'' کا فریضہ نہایت خاموشی کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں کہ دیگر جماعتیں اور پارٹیاں تو چونکہ اپنے اپنے سیاسی یا دعوتی و تبلیغی مساعی میں مصروف رہنے کے باعث اکثر بے خبر رہتی ہیں لیکن یہ حضرات قصر عقیدہ ختم نبوت میں لگنے والی کسی بھی نقب سے جو خواہ نادانستہ غفلت اور بے پروائی کی بنا پر ہو یا قادیانیوں اور ملکی بیوروکریسی کی خفیہ سازش کی بنا پر' امت کو بروقت خبردار کر دیتے ہیں تاکہ امت کے مختلف عناصر اور حلقے مجتمع ہو کر بروقت ازالہ کر سکیں''۔

درس ۲٤

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں
قتال فی سبیل اللہ یا سلسلۂ غزوات کا آغاز
اور اس کا ہدفِ آخریں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اَعُوذ باللّٰہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیْم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (الانفال:۳۹)

وَقَالَ تبارك وتعالیٰ کما ورد فی سورة التوبة:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (آیت ۱۱۱) ...... صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِیْم

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں قتال فی سبیل اللہ یا غزوات کا سلسلہ رمضان ۲ھ سے شروع ہو کر اواخر ۹ھ تک جاری رہا۔ اس طرح یہ سلسلۂ قتال و غزوات آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ اس دوران میں بہت سے ''غزوات و سرایا'' ہوئے۔ سیرتِ مطہرہ کے حوالے سے غزوہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں نبی اکرم ﷺ نے بھی بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ہو' اور ''سریہ'' (جس کی جمع سرایا ہے) اس جنگی مہم کو کہتے ہیں کہ جس کے لئے آپ نے کوئی دستہ بھیجا ہو' لیکن خود اس میں شمولیت نہ فرمائی ہو۔

غزوات کا ذکر قرآن حکیم میں

قرآن حکیم میں متعدد غزوات کا تذکرہ موجود ہے اور اس معاملہ میں ہمیں وہاں

ایک عجیب حسنِ ترتیب نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم میں مکّیات اور مدنیات کے لحاظ سے سورتوں کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان کے بارے میں بنیادی تعارفی باتیں اس منتخب نصاب کے درس کے دوران ایک موقع پر عرض کی جا چکی ہیں۔ اس سلسلے کا دوسرا گروپ اس اعتبار سے نہایت متوازن ہے کہ اس میں شامل کل چار سورتوں میں سے دو سورتیں مکّی ہیں اور دو ہی سورتیں مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکّیات ہیں اور سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ مدنیات ہیں۔ اس ترتیب میں ایک عجیب حکمت یہ نظر آتی ہے کہ سلسلۂ غزوات کی پہلی کڑی یعنی غزوۂ بدر کا ذکر سورۃ الانفال میں ہے اور اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی غزوۂ تبوک کا تفصیلی ذکر ہے سورۃ التوبہ میں۔ گویا کہ ان دونوں سورتوں کو مصحف میں متصلاً رکھ کر اس سلسلۂ غزوات کے نقطۂ آغاز اور نقطۂ اختتام دونوں کو یکجا کر دیا گیا۔

قرآنِ حکیم میں تمام غزوات کا ذکر نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن کا ذکر کیا گیا ہے یقیناً ان کی اہمیت کسی نہ کسی پہلو سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ گویا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد اور آپؐ کے مشن کی تکمیل کی اس کوشش میں اہم سنگ ہائے میل (Land Marks) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غزوات کہ جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے ان میں غزوۂ بدر ہے جو رمضان ۲ھ میں ہوا۔ قرآن حکیم کی ایک مکمل سورۃ' یعنی سورۃ الانفال اسی غزوے کے حالات و واقعات اور اس سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک انتہائی مربوط خطبے کی حیثیت سے بیک وقت نازل ہوئی' اس لئے کہ اس کے اوّل و آخر کے درمیان ایک بڑا گہرا منطقی اور معنوی ربط ہے' جس کا حوالہ بعد میں ہماری گفتگو میں آئے گا۔ غزوۂ بدر کے فوراً بعد غزوۂ بنی قینقاع ہوا' لیکن اس کا قرآنِ مجید میں ذکر موجود نہیں ہے۔ شوال ۳ھ میں غزوۂ اُحد ہوا۔ یہ غزوہ بعض اعتبارات سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کے نتائج بہت دُور رس نکلے' چنانچہ قرآن مجید میں اس غزوہ کے حالات و واقعات پر بھی نہایت بھرپور تبصرہ موجود ہے۔ سورۂ آل عمران کی

ایک سو بیسویں آیت سے یہ مضمون شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد تقریباً مسلسل ساٹھ آیات اسی غزوہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد غزوۂ بنو نضیر واقع ہوا۔ اس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۃ الحشر میں ہے۔ پھر ۵ھ میں غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق پیش آیا۔ اس کا شمار بھی انتہائی اہم غزوات میں ہوتا ہے اور سلسلۂ غزوات میں اسے ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر سورۃ الاحزاب میں مکمل دو رکوعوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے معاً بعد غزوۂ بنو قریظہ ہے جسے غزوۂ احزاب ہی کا ضمیمہ یا تکملہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب ہی میں غزوۂ احزاب کے ذکر کے ساتھ متصلاً اس کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اور غزوات بھی ہوئے' مثلاً غزوۂ مریسیع اور غزوۂ بنی مصطلق وغیرہ' لیکن قرآنِ مجید میں ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۶ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا اور یہ نبی اکرم ﷺ کی اس جدوجہد میں ایک بڑے اہم سنگِ میل (Land Mark) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم اسے فتح مبین سے تعبیر کرتا ہے' اس لئے کہ یہ اہم واقعہ فتح مکّہ کی تمہید ثابت ہوا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ پر ایک پوری سورۃ' سورۃ الفتح کے نام سے موجود ہے جس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۞﴾ اس کے بعد ۷ھ میں غزوۂ خیبر ہوا لیکن قرآن مجید میں اس کے حالات و واقعات کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ۸ھ میں ایک جانب تو جنگِ مُوتہ ہوئی اور سلطنتِ روم کے ساتھ مسلمانوں کے ٹکراؤ کا آغاز ہوا' اس کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہے' اور دوسری جانب فتحِ مکّہ جیسا اہم واقعہ ہوا' تاہم اس پر بھی قرآنِ مجید میں صراحتاً کہیں گفتگو نہیں ہوئی' بلکہ اس کا ضمناً ذکر سورۃ التوبۃ میں ملتا ہے۔ البتہ اسی سورۃ میں غزوۂ حنین کا ذکر' جسے فتح مکّہ ہی کا تکملہ یا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے' نام لے کر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی یا یوں کہئے کہ سلسلۂ غزوات کا نقطۂ عروج وہ ہے جسے ہم غزوۂ تبوک کے نام سے جانتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس غزوہ کے حالات و واقعات بھی بیان ہوئے ہیں اور ان پر بڑا مفصل تبصرہ

بھی موجود ہے۔ یہ ہے اجمالی طور پر اِن غزوات کی تاریخ وار ترتیب کہ جو ہجرت کے بعد آٹھ سالوں کے دوران حیاتِ نبوی ﷺ میں واقع ہوئے۔ اب اس سے پہلے کہ ہم ان غزوات کا جو ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہے اور ان کی جن اہم باتوں کی طرف قرآنِ مجید میں توجہ دلائی گئی ہے' ان پر جستہ جستہ غور کرنا شروع کریں' مناسب یہ ہوگا کہ تمہیدی طور پر اپنے ذہن میں اس صورتِ حال کا ایک نقشہ قائم کرلیا جائے جس سے آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ مدینہ میں دوچار تھے اور یہ کہ کس طرح آپ نے غلبۂ دینِ حق کے اس مشن کو' جسے سورۃ الصف میں آپ ﷺ کا مقصدِ بعثت قرار دیا گیا' مدنی دَور میں درجہ بدرجہ تکمیل تک پہنچایا۔

مدینہ کے خاص حالات

ہم آنحضور ﷺ کی مکّی زندگی سے متعلق کچھ باتوں پر اِس سے پہلے غور کر چکے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کیا صورت حال تھی۔ مدینہ منوّرہ میں اوس اور خزرج کے نام سے دو قبیلے تو وہ تھے کہ جن کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ وہاں کے اصل راجپوت قبیلے تھے۔ اوس نسبتاً چھوٹا قبیلہ تھا جبکہ خزرج عددی اعتبار سے بڑا قبیلہ تھا۔ ان کے علاوہ تین یہودی قبیلے بھی وہاں آباد تھے جن کی حیثیت کچھ مہاجنوں کی سی تھی۔ ان کا نہ صرف علمی اعتبار سے وہاں ایک رعب اور دبدبہ تھا بلکہ تہذیبی وتمدنی اور ثقافتی اعتبار سے بھی ان کی مدینہ میں ایک حیثیت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپے پیسے کے اعتبار سے بھی انہیں برتری حاصل تھی۔ یہ قبائل مدینے کے اطراف میں آباد تھے اور نہایت مضبوط گڑھیوں اور قلعوں میں رہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینے تشریف لائے تو اوس اور خزرج کی اکثریت ایمان لے آئی۔ ان میں سے اگرچہ کثیر تعداد ان لوگوں کی تھی جو صدقِ دل سے ایمان لائے تھے تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس بنا پر ایمان لائے کہ چونکہ سردارانِ قبیلہ ایمان لے آئے ہیں تو ہم بھی اسلام قبول کئے دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے کہ جو ایمان تو لے آئے لیکن بادلِ ناخواستہ۔ اس طور سے ایمان

لانے والوں میں دو شخصیتیں بہت نمایاں ہیں' ابوعامر اور عبداللہ بن اُبَی بن سلول۔ دونوں کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا کہ جو زیادہ طاقتور اور بڑا قبیلہ تھا۔ ابوعامر کی نیکی اور دینداری کا وہاں لوہا مانا جاتا تھا اور عبداللہ بن اُبَی بن سلول کی سیاسی سمجھ بوجھ کے سب معترف تھے اور اسے ایک بڑا سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے ورودِ مدینہ سے متصلاً قبل اوس اور خزرج کے مابین اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبَی بن سلول کو بادشاہ مان کر مدینے میں باقاعدہ ایک بادشاہی نظامِ حکومت قائم کر دیا جائے۔ تاج تیار ہو چکا تھا' لیکن جب آنحضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ظاہر بات ہے کہ خورشیدِ رسالت کے طلوع ہونے کے بعد اب نہ ابوعامر راہب کی نیکی اور دینداری کا چراغ جل سکنے کا کوئی امکان موجود تھا اور نہ ہی اب وہ صورت برقرار رہی کہ کسی کے سر پر یہاں تاجِ شاہی رکھا جا سکے۔ اب وہاں دینی و مذہبی ہی نہیں سیاسی اعتبار سے بھی سیادت و قیادت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہو گئی تھی۔

اس مرحلے پر یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے اور اس سے قبل بھی اس جانب توجّہ دلائی جا چکی ہے کہ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان جان بچا کر مکّہ سے مدینہ نہیں آئے تھے' یہ فرار نہیں تھا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) بلکہ یہ ایک اہم مقصد کے لئے ایک ایسے مرکز (Base) میں جمع ہونے کا ایک عمل تھا کہ جو اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ اور مسلمانوں کو عطا فرمایا تھا' تاکہ غلبہ دینِ حق کے اس اہم مقصد کی طرف پیش قدمی کی جا سکے جس کے لئے نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ مدینے کو دارالہجرت اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

آنحضور ﷺ کی دُوراندیشی کا شاہکار

نبی اکرم ﷺ نے مدینے تشریف لاتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ آپ کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے فوری طور پر ایک نقشہ کار تیار کیا کہ جس کے مختلف تقاضے آپ کے سامنے اس وقت پوری وضاحت کے ساتھ موجود تھے' چنانچہ اس کے مطابق عملی

اقدامات کا آغاز فرمادیا۔ مدینہ تشریف لاتے ہی آپؐ نے پہلا کام یہ کیا کہ یہودیوں سے معاہدے کر لئے۔ اور اس طرح انہیں معاہدوں میں جکڑ لیا کہ بعد کے نو دس سالوں کے دوران ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہود ان معاہدوں کی وجہ سے ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف شدید جذبات رکھنے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے اور خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے' ہاں در پردہ سازش اور ریشہ دوانی کرنے کی کوششیں انہوں نے ضرور کیں اور بعض مواقع پر مشرکین مکّہ کو اشتعال دلا کر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی لیکن وہ براہِ راست اور کھلم کھلا نبی اکرم ﷺ کے مقابلے میں نہیں آ سکے۔ یہی معاہدے کہ جو اُن کے پاؤں کی بیڑیاں بنے تھے بالآخر اُن کے گلے کا طوق بھی بنے۔ اور انہی معاہدوں کو توڑنے کی پاداش میں وہ تینوں قبیلے باری باری اپنے انجام کو پہنچے۔ ان میں سے دو قبیلوں کو مختلف مراحل پر مدینہ بدر کیا گیا اور ایک کو اُن کی بدعہدی کی سخت ترین سزا دی گئی کہ ان کے تمام لڑائی کے قابل مَردوں کے سر قلم کئے گئے۔

مسلمانوں کی جنگ دفاعی نہیں تھی!

اس حوالے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس دَور میں ہمارے بعض دانش وروں اور اہلِ علم نے سیرتِ طیّبہ کے ان غزوات کے معاملے میں جو معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ یہ صرف دفاعی جنگ تھی ورنہ اسلام اپنے غلبے کے لئے جنگ اور خون ریزی کے راستے کو اختیار نہیں کرتا' یہ درست نہیں ہے۔ مغرب سے یہ بات دراصل کچھ اس انداز میں طعنے کے طور پر ہمارے بارے میں کہی گئی اور یہ الزام کچھ اس شدّت کے ساتھ لگایا گیا کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے'' کہ ردِّعمل کے طور پر ہمارے ہاں سے ایک نہایت معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور یہ انداز بالخصوص ان طبقات نے اختیار کیا جو مغرب کی مادّی اور سائنسی ترقی سے ذہنی طور پر مرعوب تھے۔

اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں کہ ابتداء بہر حال اہلِ مکّہ کی طرف سے ہوئی' لیکن

وہ ابتداء ان معنوں میں تھی کہ انہوں نے مکّہ میں مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور انہیں ان کے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اس اعتبار سے گویا کہ مشرکینِ مکّہ کی طرف سے تو جنگ کا اعلان پہلے سے تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ مکّی دَور میں اہلِ ایمان کے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا تھا۔ انہیں حکم تھا: ﴿کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ﴾ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر پابندی تھی اور انہیں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ وہ اجازت آ گئی۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' دورانِ سفرِ ہجرت سورۃ الحج کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ﴾ (آیات ۳۹'۴۰)

''آج اجازت دی جا رہی ہے ان کو کہ جن پر جنگ ٹھونسی گئی تھی' اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا۔ (اب وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے (جو گھر بار کو چھوڑ کر ترکِ وطن پر مجبور کر دیئے گئے) صرف اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے۔''

گویا کہ اس معنی میں اگر کہا جائے کہ آغاز مشرکینِ مکّہ کی طرف سے ہوا تو بات غلط نہیں ہے' لیکن اگر اس کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ مدینے پر حملہ بھی یک طرفہ طور پر انہی کی جانب سے تھا اور مسلمانوں نے مدافعانہ جنگ لڑی ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تمکن عطا فرمایا اور مسلمانوں کو ایک مرکز میسر آ گیا تو آپؐ نے مکّے کی طرف اقدام کا آغاز کر دیا۔ مکّے کی جانب آنحضور ﷺ کی اوّلین پیش قدمی کس طور سے ہو سکتی تھی' اسے اس واقعے کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ عمرے کے لئے مکّے تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے۔ ابوجہل پوچھتا ہے یہ کون صاحب ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سعد بن معاذؓ ہیں تو وہ بپھر کر غصے میں کہتا ہے کہ تم نے ہمارے بھگوڑوں کو

پناہ دی ہے اور اگر تم لوگوں نے انہیں اپنے ہاں سے نکال باہر نہ کیا تو ہم بیت اللہ میں تمہارا داخلہ بند کر دیں گے۔ اس کا فوری جواب جو حضرت سعد بن معاذؓ نے دیا وہ یہ تھا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہاری اس تجارتی شاہراہ کو بند کر دیں گے جو تمہاری رگِ جاں کی حیثیت رکھتی ہے اور جو مدینے کے قریب سے ہو کر گزرتی ہے۔ ابوجہل کی دھمکی کے جواب میں فوری طور پر حضرت سعد بن معاذؓ کا ذہن اس جانب منتقل ہو گیا۔ آنحضور ﷺ نے قریش مکّہ کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔

غزوۂ بدر کا ایک اہم سبب..... کفارِ مکّہ کی معاشی ناکہ بندی

جدید اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مکّے والوں کا Economic Blockade کر دیا' ان کے تجارتی راستوں کو مخدوش بنا کر ان کی معاشی ناکہ بندی کا سامان کر دیا۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں یہ حقائق محفوظ ہیں کہ غزوۂ بدر سے قبل آنحضور ﷺ نے ان تجارتی راستوں کو مخدوش بنانے کے لئے آٹھ مہمیں روانہ کیں' جن میں سے بعض میں آپؐ نے خود بھی شرکت فرمائی۔ انہی میں سے ایک مہم کے دوران مسلمانوں کے ہاتھوں ایک قرشی کافر مارا بھی گیا' گویا اس معاملے میں پہل مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مکّے والوں کی معاشی ناکہ بندی کرنا درحقیقت سانپ کو بل سے نکلنے پر مجبور کر دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ابوجہل اور اس کے وہ ساتھی جو قریش میں سے Hawks کی قسم کے تھے اور کسی نہ کسی بہانے سے بہرصورت مدینے پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے' انہیں اس حوالے سے ایک موقع مل گیا۔ انہوں نے جس چیز کو بنیاد بنایا وہ یہی تھی کہ مسلمانوں نے ہمارے تجارتی قافلوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں' ہمارا ایک آدمی قتل کر دیا ہے اور اب ہمارا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ جو مال و اسباب سے لدا پھدا شام سے واپس آ رہا ہے' اسے محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ ان باتوں کو بنیاد بنا کر کیل کانٹے سے لیس ہو کر ایک ہزار کا لشکر مکّے سے نکلا۔ ادھر نبی اکرم ﷺ کو بھی خبریں پہنچ رہی تھیں۔

آپؐ نے اپنے طور پر بھی گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے اور کفّارِ مکّہ کے ردِّعمل کا جائزہ لینے کے لئے خبریں حاصل کرنے کا ایک مؤثر نظام تشکیل دیا ہوا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ کے لئے تو خبر کا ایک دوسرا اور معتبر ترین ذریعہ وحیٔ الٰہی کی صورت میں بھی موجود تھا۔

غزوۂ بدر سے قبل آنحضور ﷺ کی مشاورت

آپؐ تین سو تیرہ جاں نثار ساتھیوں کی معیت میں مدینہ سے نکلے اور ذرا باہر نکل کر اور ایک رائے کے مطابق مدینہ کے اندر ہی (یہ کچھ اہم تاریخی واقعات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور وہاں مسئلہ یہ رکھا کہ ایک طرف تو قافلہ ہے جو قریش کے سردار ابوسفیانؓ (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) کے زیرِ قیادت شام سے آ رہا ہے' اس کے ساتھ کل پچاس محافظ ہیں' اور دوسری جانب ایک لشکر ہے جو مکّے سے نکلا ہے' اب تم لوگ سوچ کر مشورہ دو کہ ہمیں کس طرف کا رخ کرنا چاہئے' کس کی طرف بڑھنا چاہئے۔ یہ انداز درحقیقت آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے عزم و ہمت (morale) کا اندازہ کرنے کے لئے اختیار فرمایا تھا کہ ان کے اندر اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جانفشانی کا جذبہ کس درجے میں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس موقع پر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے لبریز تھی۔ آنحضور ﷺ نے ایک خاص سبب سے اس تقریر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے تقریر فرمائی' آپؐ نے اُدھر بھی کوئی خصوصی التفات نہیں فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مقدادؓ نے تقریر کی۔ ان کی تقریر اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں آپ اصحابِ موسیٰؑ پر قیاس نہ کیجئے کہ جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۞﴾ آپؐ جدھر کا بھی ارادہ رکھتے ہوں بسم اللہ کیجئے! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعے سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما

دے..... لیکن آنحضور ﷺ پھر بھی ابھی کچھ منتظر سے تھے۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے جو رؤساءِ انصار میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔ وہ چونکہ خزرج کے سردار تھے لہٰذا مدینے میں گویا کہ ان کی حیثیت سب سے بڑھ کر تھی۔ انہوں نے اس بات کو بھانپتے ہوئے کہ آنحضور ﷺ کس چیز کے انتظار میں ہیں' کھڑے ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔

اس معاملہ کا پس منظر جان لینا چاہئے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ہونے والا وہ قول و قرار جو آنحضورؐ اور اہل مدینہ کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں مدینہ دارالہجرت بنا' اس میں یہ شق تو موجود تھی کہ مدینے پر اگر کوئی حملہ آور ہو گا تو انصار آنحضور ﷺ کا ساتھ دیں گے اور آپؐ کی طرف سے مدافعت کریں گے' لیکن ایسی کوئی صورت کہ مدینے سے باہر نکل کر کہیں اگر جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو اس میں آنحضور ﷺ کا ساتھ دینے یا نہ دینے کی بات اس قول و قرار میں زیر بحث نہیں آئی تھی اور کوئی معاہدہ اس بارے میں طے نہیں پایا تھا۔ یہی وہ بات تھی کہ جس کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کی نگاہیں بار بار انصار کی طرف اٹھ رہی تھیں اور آپ انتظار میں تھے کہ ان کی طرف سے بھی کوئی بات اس موقع پر سامنے آئے..... اس پس منظر میں حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ یہ گویا ان کی جانب سے اس حقیقت کا اظہار تھا کہ یہ چیز اب اہمیت کی حامل نہیں رہی کہ بیعتِ عقبہ اولیٰ میں یا ثانیہ میں کیا طے ہوا تھا اور کیا طے نہیں ہوا تھا۔ صورت حال یہ ہے کہ ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے' آپؐ کو رسول مانا ہے' اب آپؐ جدھر کا بھی حکم دیں گے ہم حاضر ہیں۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے کہ ہم اپنی سواریوں سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دیں تو ہم حاضر ہیں' اور اگر آپ ہمیں برک الغماد تک چلنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنے اونٹوں کو مسلسل دوڑاتے اور لاغر کرتے ہوئے وہاں تک پہنچا دیں تو ہم ان شاء اللہ آپ کے اس حکم کی بھی تعمیل میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔ آنحضور ﷺ نے جب حضرت سعد بن عبادہؓ کی یہ جذبات پرور تقریر سنی تو آپؐ

کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ یہ درحقیقت اصحاب رسول ﷺ کی جانب سے جاں نثاری اور دین کے لئے سرفروشی اور جانفشانی دکھانے کے عزم کا اظہار تھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے مشن کی تکمیل کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کر دینا باعث سعادت سمجھتے تھے۔

اللہ اور مسلمانوں کے مابین بیع و مبایعت

آج گفتگو کے آغاز میں سورۂ براءۃ کی جس آیت کی تلاوت کی گئی تھی اس میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ گویا ایک بیع و شراء ہو چکا ہے' ایک سودا طے پا چکا ہے۔ اس جسم و جان اور مال و منال کی حیثیت ایک امانت کی ہے کہ جیسے ہی مطالبہ ہو' حاضر کر دیں۔ چنانچہ اس آیت کے یہ الفاظ خاص طور پر لائق توجہ ہیں: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں' قتل کرتے بھی ہیں اور خود قتل ہوتے بھی ہیں۔ یعنی میدانِ جنگ میں پامردی اور جانفشانی سے کام لیتے ہوئے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے باغیوں کی گردنیں اڑاتے ہیں وہاں خود اپنی جانوں کا نذرانہ بھی بارگاہِ ربانی میں پیش کر کے سرخرو ہونے کو باعث اعزاز جانتے ہیں۔ اس کے بعد اہل ایمان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ: ﴿وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ﴾ جو معاہدہ ہوا ہے' جو بیع و شراء ہوا ہے' اب اس کا پورا کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ یعنی اہل ایمان اگر اس معاہدے کو نبھائیں گے تو اللہ کا یہ پختہ وعدہ ہے کہ اس کی قیمت وہ جنت کی شکل میں اہل ایمان کو ضرور ادا کرے گا۔ یہ وہ پختہ وعدہ ہے جو توراۃ میں بھی ہوا' انجیل میں بھی ہوا اور انتہائی موثق اور مؤکد انداز میں قرآن میں بھی ہوا۔ مزید تسلی کے لئے فرمایا: ﴿وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا اور کون ہوگا؟ ﴿فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ تو اے اہل ایمان! خوشیاں مناؤ اس بیع کی جو تم نے کی ہے۔ وہ سودا جو تم

نے کیا ہے اس سے زیادہ کامیاب اور اس سے زیادہ نفع بخش سودا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ﴿وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ ''اور یہی تو ہے اصل اور بڑی کامیابی''!

قتال فی سبیل اللہ کا اصل ہدف

اس قتال فی سبیل اللہ کا قرآن حکیم نے جو ہدف معین کیا ہے وہ بھی واضح طور پر ہمارے سامنے رہنا چاہئے۔ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ کے درج ذیل الفاظ کے حوالے سے بھی یہ مضمون ہمارے مطالعے میں آچکا ہے کہ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ﴾ اے مسلمانو! جنگ کرو اِن کفار اور مشرکین سے' یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ یہی بات انتہائی مؤکد ہو کر قدرے مزید تفصیل کے ساتھ سورۃ الانفال میں بھی آئی ہے کہ جس میں غزوۂ بدر کے حالات و واقعات کا تفصیلی ذکر موجود ہے' جو نقطۂ آغاز ہے اس سلسلۂ قتال کا۔ وہاں فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ اور ان کفار اور مشرکین کے ساتھ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی کے بعض گوشوں میں اللہ کی اطاعت ہو رہی ہو اور بعض گوشوں میں اپنے نفس کی یا زمانے کے چلن کی یا کسی باطل نظام کی پیروی کی جا رہی ہو۔ زندگی کا ہر گوشہ اور بالخصوص اجتماعی نظام جب تک اللہ کے تابع نہیں ہوتا تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہئے۔

سورۃ الصف کی مرکزی آیت جب ہمارے زیر مطالعہ تھی کہ جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ۭ﴾ تو اُس وقت عرض کیا گیا تھا کہ یہاں پر ''الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' سے کل کا کل نظام زندگی مراد ہے۔ اس کے لئے سورۃ الانفال کی یہ آیت درحقیقت ''اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اعتبار سے ایک یقینی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے کہ ''الدِّین'' کے لئے بدل کے طور پر ''کُل'' کا لفظ یا تو سورۃ الصف کی اس آیت میں آیا ہے جو قرآن حکیم میں دو اور مقامات پر بھی وارد ہوئی ہے اور یا سورۃ الانفال کی اس آیت میں آیا ہے کہ:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ اور یہاں کُل دین کا ترجمہ تمام ادیان کرنا ممکن نہیں۔ پورا نظامِ زندگی بحیثیتِ کُل اللہ کے دین کے تحت آ جائے' یہ ہے مقصدِ بعثت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا۔

غزوۂ بدر..... یوم الفرقان

سورۃ الانفال' جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' تقریباً پوری کی پوری غزوۂ بدر ہی سے متعلق ہے۔ بعض ایسے مسائل جو غزوۂ بدر کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے' مثلاً مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ' ان کا حل بھی اس سورۃ میں تجویز کیا گیا اور اس غزوے کے دوران جو حالات پیش آئے اور مسلمانوں سے اگر کہیں کسی کوتاہی کا صدور ہوا' ان سب پر اللہ کی طرف سے ایک نہایت جامع تبصرہ اور آئندہ کے لئے اصولی ہدایات بھی اس سورۂ مبارکہ میں شامل ہیں۔ گویا پوری سورۃ غزوۂ بدر کے گرد گھومتی ہے۔ غزوۂ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان قرار دیا' یعنی حق و باطل کے مابین تمیز والا دن۔ اس دن معلوم ہو گیا کہ اللہ کی نصرت و حمایت کس کے ساتھ ہے' ان کفارِ مکّہ کے ساتھ کہ جو ایک ہزار کی تعداد میں ہر طرح کے ہتھیار سجا کر میدانِ بدر میں آئے تھے یا ان تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں کے ساتھ جن کا رسالہ کل دو گھوڑوں پر مشتمل تھا اور جن میں سے سب کے پاس ہتھیار بھی مکمل نہ تھے۔ کسی کے پاس تلوار تھی تو نیزہ نہ تھا اور اگر نیزہ کسی کے پاس تھا تو تلوار نہ تھی' اور ایسے بھی تھے جو نیزہ اور تلوار دونوں سے تہی تھے۔ پھر یہ کہ ان بے سروسامان مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان انصار پر مشتمل تھی کہ جن کو قریش جنگجو قوم ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے بارے میں قریشِ مکّہ کا یہ خیال تھا کہ یہ کاشت کار لوگ ہیں' لڑنے بھڑنے سے انہیں کیا سروکار! وہ تین سو تیرہ ایک ہزار کے کیل کانٹے سے لیس ہر طرح سے مسلح لشکر سے ٹکرا گئے اور اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ یوم سمجھئے کہ مکّے نے اپنی اصل طاقت کو وہاں اگل دیا تھا' اس کی کُل جمعیت میدانِ بدر میں موجود تھی۔ عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل جیسے بڑے بڑے سردار کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند

میدانِ بدر میں پڑے تھے۔ وہ دن واقعی یوم الفرقان تھا' اس نے حق و باطل کے مابین تمیز کر دی' دودھ کا دودھ پانی کا پانی جدا کر دیا۔ اس شاندار فتح سے مسلمانوں کا مورال یقیناً بہت بلند ہوا۔ پورے علاقے پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ اس طرح ہجرت کے دو ہی سال بعد صورتِ حال ایک دم اس طرح تبدیل ہو گئی کہ وہ کسمپرسی اور مظلومیت کا دَور گویا کہ ختم ہوا اور مسلمانوں کی دھاک پورے علاقے پر بیٹھ گئی۔ صورتِ حال کی یہ ساری تبدیلی دراصل نتیجہ تھا غزوۂ بدر کا جسے اللہ تعالیٰ نے بجا طور پر یوم الفرقان قرار دیا تھا!

بندۂ مؤمن کی تصویر کے دو رُخ

غزوۂ بدر کے جن حالات اور واقعات پر تبصرہ سورۃ الانفال میں آیا ہے ظاہر بات ہے کہ اس مختصر گفتگو میں اس کی اہم باتوں کی طرف بھی اشارہ ممکن نہیں ہے' البتہ سورۃ الانفال کے آغاز و اختتام پر وارد شدہ چند آیات کے حوالے سے بطورِ یاددہانی ایک ایسی حقیقت کی طرف توجہ مناسب رہے گی کہ جو ہمارے اس منتخب نصاب کے لئے گویا کہ عمود اور اس کے مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے بالکل شروع میں اور پھر اس کے اختتام پر ایسی آیات وارد ہوئی ہیں کہ جنہوں نے سورۃ الحُجُرات کی آیت ۱۵ کی مانند حقیقی ایمان کی تعریف کو بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اپنے اندر سمو لیا ہے اور ایمان کے دونوں اجزاء (یعنی یقینِ قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ) کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ الگ الگ نمایاں کیا ہے۔ ایمانِ حقیقی کے کچھ اثرات تو وہ ہیں جن کا تعلق باطنی کیفیات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ کی یاد اگر دل میں تازہ ہو' اس کی عظمت اور دبدبہ و جلال سے اگر انسان کو کسی قدر آگاہی ہو اور ہر دم یہ احساس اگر اس کے دامن گیر ہو کہ اس کا ہر عمل اللہ کی نگاہ میں ہے تو اس کا طرزِ عمل ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے' اس کے صبح و شام کے انداز میں ایک خاص تغیر واقع ہوتا ہے جو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جھوٹ موٹ کا مدعیٔ ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان اس کے

دل میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور ایمانِ حقیقی کا دوسرا رکن رکین وہ ہے جس کے لئے سورۃ الحُجُرات میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے الفاظ آئے ہیں اور جس کا ذکر اس کے بعد سورۃ الصّف میں بھی ہمارے مطالعے میں آ چکا ہے۔ سورۃ الانفال میں ایمان کے ان دونوں ارکان کو ایک اچھوتے انداز میں جمع کیا گیا ہے۔ آغاز میں آیات ۲ تا ۴ میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾

''مؤمن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے' اور وہ اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے لگاتے اور کھپاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً مؤمن ہیں۔ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس اعلیٰ درجات اور بخشش اور نہایت اعلیٰ رزق ہے۔''

بندۂ مؤمن کی زندگی کا ایک رُخ' یا یوں کہئے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تصویر کا ایک پہلو اِن تین آیات میں آ گیا۔ اسی تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جو سورۃ الانفال کے بالکل آخر میں آیت ۷۴ میں آ رہا ہے۔ یہاں ذہن میں رکھئے کہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت کے بعد وہ تین آیات آئی ہیں جن کا مطالعہ ابھی ہم نے کیا' جن میں بندۂ مؤمن کی تصویر کا ایک دوسرا رُخ سامنے آتا ہے اور اس سورۃ کی آخری آیت سے پہلی (Last but one) آیت میں دوسرے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جس کا اب ہمیں مطالعہ کرنا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ (آیت ۷۴)

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور انہوں نے جہاد کیا

اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی' یہ ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقی مؤمن ہیں۔ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور بہت اعلیٰ رزق بھی۔''

معلوم ہوا کہ بندۂ مؤمن کی تصویر کے یہ دو رُخ ہیں اور ان دونوں کے مجموعے سے ہی بندۂ مؤمن کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں اہلِ ایمان کی زندگی کا ایک نقشہ سامنے لایا گیا تھا اور وہاں ہجرت اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ والے پہلو کو اُجاگر کیا گیا تھا۔ یہ وہی بات ہے جس کا تذکرہ یہاں سورۃ الانفال کے آخر میں آیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت کے الفاظ ذرا ذہن میں تازہ کیجئے:

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا.....﴾ (آیت ۱۹۵)

دوسرا نقشہ یا بندۂ مؤمن کی تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جو اس سے قبل ہمارے زیرِ مطالعہ آچکا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ (النور:۳۷)

اب دونوں کو جمع کرنے سے بندۂ مؤمن کی شخصیت کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق ایک ہی حقیقت کو مختلف اسالیب میں بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات اس کی واضح مثال کا درجہ رکھتی ہیں۔

غزوۂ اُحد۔ فتح کے بعد وقتی شکست

سورۃ الانفال کی ان ابتدائی اور آخری آیات کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اوّل و آخر کے مابین بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے اور اس سے اس جانب بھی رہنمائی ملتی ہے کہ یہ پوری سورۂ مبارکہ بیک وقت ایک مربوط خطبے کی حیثیت سے نازل ہوئی۔ آگے چلئے! غزوۂ بدر سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی

اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آس پاس کے قبائل پر مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن اگلے ہی سال صورتِ حال اس کے برعکس ہو گئی۔ اہل مکّہ نے بدر کی شکست کے بعد مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے اپنی پوری قوتوں کو جمع کیا۔ انتقام لینا عربوں کی گھٹی میں شامل ہے۔ اپنے ستر سربرآوردہ لوگ جن کی لاشوں کو وہ میدانِ بدر میں چھوڑ آئے تھے' ان کے انتقام کی آگ قریش مکّہ کے سینوں میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ پورے اہتمام اور پوری تیاری کے ساتھ اگلے ہی سال ۳ ہجری کے ماہِ شوال میں تین ہزار کا لشکر جرار اب براہِ راست مدینے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لشکر کی خبر سن کر آنحضور ﷺ مشاورت طلب فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا رجحان یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق کہ یہی رائے منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبی کی تھی۔ لیکن مسلمانوں میں سے کچھ نوجوان جن کے دل شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد سے معمور تھے' ان کا جوش اور جذبہ اس درجے تھا کہ انہوں نے اس پر زور دیا اور اصرار کیا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس جذبۂ ایمانی کا لحاظ رکھا اور اپنی رائے پر ان کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا۔ دامنِ اُحد میں مقابلہ ہوا۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ نفاق کا عملی ظہور ہوتا ہے۔ اگرچہ غزوۂ بدر کے بیان میں بھی قرآن مجید نشان دہی کرتا ہے کہ اُس وقت بھی ایسے کچھ لوگ موجود تھے جو یہ چاہتے تھے کہ لشکرِ کُفّار کا مقابلہ کرنے کی بجائے ابوسفیان جس قافلہ کو لے کر شام سے آ رہے تھے اس کا تعاقب کیا جائے۔ چنانچہ اس پر قرآن مجید نے اسی اعتبار سے تنقید بھی کی کہ ان لوگوں کو شاید دنیا زیادہ عزیز تھی' یا پھر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا ان کے نزدیک کچھ اتنا زیادہ خوش آئند نہ تھا' لیکن یہ ابھی ابتدا تھی اور مرضِ نفاق ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا تھا۔

ابھی تک جو معاملہ صرف ضعفِ ایمان کا تھا اگلے سال غزوۂ اُحد کے موقع پر وہ نفاق ایک ادارے کی حیثیت سے پوری طرح سامنے آتا ہے کہ عین اس وقت جب نبی

اکرم ﷺ ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ منورہ سے نکلے اور ابھی میدانِ جنگ تک نہیں پہنچے کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول اسی بات کو بہانہ بنا کر تین سو اشخاص کو لے کر مدینہ واپس چلا جاتا ہے کہ چونکہ میری رائے پر عمل نہیں ہوا' مدینے کے اندر رہ کر چونکہ مقابلہ نہیں کیا جا رہا لہٰذا ہم ساتھ نہیں دیں گے۔ اور اب دامنِ اُحد میں محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہزار کی نفری میں سے سات سو افراد باقی رہ جاتے ہیں۔ اس جنگ کی تفصیل بیان کرنا یہاں ہمارے پیش نظر نہیں ہے' صرف بعض واقعات اور ان کے نتائج کی جانب مختصر اشارہ مقصود ہے۔ پہلے ہی ہلے میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی' کفار میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے' لیکن پھر نبی اکرم ﷺ کے ایک حکم کی خلاف ورزی جو بعض مسلمانوں سے صادر ہوئی' اس کا ایک فوری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ فتح عارضی طور پر شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم کا شہید ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ان ستر میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب بھی شامل تھے اور حضرت مصعب بن عمیر بھی' رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ وہ مصعب کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کے نتیجے میں اہل یثرب کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی تھی اور مدینہ منورہ کو دارالہجرت بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ستّر صحابہؓ نے میدانِ اُحد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ خود آنحضور ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' آپؐ پر کچھ دیر کے لئے غشی طاری ہوئی۔ یہ بات اڑا دی گئی کہ آنحضور ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی ہمتیں جواب دے گئیں یہاں تک کہ حضرت عمر ﷺ نے بھی تلوار پھینک دی۔ ان سارے حالات و واقعات کا ظاہر بات ہے کہ تفصیلاً بیان یہاں ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید نے غزوۂ اُحد کے حالات پر بڑا مفصل تبصرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض آیات کا مطالعہ ہم ان شاء اللہ ابھی کریں گے۔ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ بدر کے بعد قبائل عرب پر مسلمانوں کی جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ جاتی رہی۔ میدانِ بدر میں تین سو تیرہ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی تھی اس کا وہ تاثر برقرار نہ رہا' اس لئے کہ غزوۂ اُحد کے بعد صورت یہ سامنے آئی کہ وہاں (بدر میں) اگر ستّر کفار قتل ہوئے تھے تو

یہاں (دامنِ اُحد میں) ستر مسلمان شہید ہو گئے۔ اس طرح وہ دبدبہ اور رعب جو مسلمانوں کا قائم ہوا تھا' وہ اب جاتا رہا۔ قریش مکّہ آس پاس کے لوگوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہے کہ یہ فتح وشکست کا معاملہ تو اتفاق ہوتا ہے' کبھی کوئی ایک فریق غالب آ جاتا ہے اور کبھی فتح دوسرے کا مقدر بنتی ہے' اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں اور ان کو اللہ کی خصوصی تائید حاصل ہے۔ تو غزوۂ اُحد کے بعد کے ایک دو سال مسلمانوں کے لئے بڑی ہی آزمائش کے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اطراف و جوانب میں سب لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں' تاخت وتاراج ہو رہا ہے' ان پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑی سختی کا تھا اور اس سختی کا نقطۂ عروج ہے غزوۂ احزاب جو غزوۂ اُحد کے دو سال بعد پیش آیا۔

غزوۂ اُحد کا ذکر قرآن حکیم میں

غزوۂ اُحد پر نہایت مفصل تبصرہ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۲۱ تا ۱۸۰ میں وارد ہوا ہے۔ ان میں سے صرف چند آیات کا رواں ترجمہ اس وقت کر لینا مناسب ہوگا تاکہ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جو وقتی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کے جو اثرات مسلمانوں پر مرتب ہو رہے تھے' ان کے حوالے سے یہ بات سامنے آ جائے کہ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو کیا رہنمائی عطا فرمائی گئی۔ یہ سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸ ہیں کہ جن کا ترجمہ میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''اے مسلمانو! نہ بددل ہو اور نہ ہی غمگین' اگر تم ایمان پر ثابت قدم رہے تو بالآخر غالب تم ہی ہو گے' تم ہی سربلند ہو گے''۔

اگلی آیت میں تسلی کے انداز میں فرمایا:

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ﴾

''اگر تمہیں ایک زخم لگا ہے (تمہیں اگر کوئی چرکا لگا ہے) تو سوچو تمہارے

دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکا لگ چکا ہے''۔

گویا کہ بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ وہ اگر اس چرکے سے بددل نہ ہوئے اور اپنے معبودانِ باطل کے لئے ان کی سرفروشی کا عالَم یہ ہے کہ تمہارے ہاتھوں ایک نہایت کاری زخم کھانے کے باوجود اگلے ہی سال وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے پھر تم پر حملہ آور ہو گئے تو تم کیوں اپنا دل تھوڑا کر رہے ہو۔

ابتلاء و آزمائش کی حکمت

اس کے بعد آیت کے اگلے ٹکڑے میں واضح فرما دیا کہ حالات کی یہ تبدیلی اور فتح وشکست کا یہ الٹ پھیر بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾

''یہ تو وہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے مابین الٹتے پلٹتے رہتے ہیں''۔

یہ اونچ نیچ کا معاملہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کے تحت کرتا ہے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۗ﴾

''تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کون ہیں واقعتاً اہل ایمان اور تاکہ وہ تم میں سے بعض کو گواہ بنالے۔ (کچھ کو مرتبہ شہادت عطا فرمادے)''۔

ابتلاء و آزمائش کی یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جائے گا۔ ان امتحانات کے ذریعے تمہارے ایمان کو جانچنا مقصود ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ العنکبوت کے درس میں ہمارے زیر مطالعہ آ چکا ہے' بلکہ سورۃ البقرۃ کی بعض آیات کے حوالے سے بھی سامنے آ چکا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ تم میں سے بعض جاں نثاروں کی جان کا نذرانہ قبول کر کے وہ تم میں سے کچھ کو گواہ بنالینا چاہتا ہے' انہیں شہادت سے سرفراز فرمانا چاہتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ پورے قرآن حکیم میں صرف یہ وہ آیت ہے کہ جہاں ''شہید'' کے معنی مقتول فی سبیل اللہ لینے کا امکان ہے۔ گویا مسلمانوں کے لئے خوشخبری ہے کہ اللہ ان میں سے بعض سرفروشوں کو کہ جو اپنی جان دے کر اللہ کی گواہی دیں' اس بلند مرتبے اور مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے جس کا نام

مرتبۂ شہادت ہے۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔

کہیں شیطان تمہارے ذہن میں یہ خیال نہ ڈال دے کہ اللہ نے اگر کفّار کو کچھ فتح دے دی ہے تو شاید وہ اب کفّار سے محبّت کرنے لگا ہے!

اگلی آیت میں اس حکمتِ ابتلاء کو مزید واضح فرمایا گیا: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''تمحیص'' کا لفظ کسی چیز کو چھان پھٹک لینے کے مفہوم میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو بول چال میں بحث و تمحیص کی ترکیب عام استعمال ہوتی ہے۔ بحث کے معنی ہیں کریدنا اور تمحیص سے مراد ہے کہ جو کچھ کرید کر حاصل ہوا ہے اس کو چھان پھٹک کر اس میں سے جو چیز مطلوب ہے' اسے نکال لینا۔ تو ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اور تاکہ اللہ اہلِ ایمان کی چھانٹی کرے'' یعنی اللہ چاہتا ہے کہ اس طرح کے کٹھن امتحانات سے اہلِ ایمان کو گزار کر انہیں جانچ لے کہ ان میں سے کون واقعتاً اللہ' اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں اور کون ہیں کہ جو نام نہاد مؤمن ہیں اور محض روایتی طور پر اور دوسروں کی تقلید میں دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے ہیں' کہ چونکہ قبیلے کے سردار نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا لہٰذا وہ بھی اس کی پیروی میں ایمان لے آئے۔ ﴿وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ ''اور تاکہ اللہ کافروں کو مٹا دے''۔ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ کافروں کو تو بالآخر مٹا کر چھوڑے گا' البتہ اس درمیانی عرصے میں یہ اونچ نیچ اس غرض سے ہوتی ہے کہ امتحان' ابتلاء اور آزمائش کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ اس کے بعد آتی ہے وہ آیت جس کا اس سے پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے واقعتاً جہاد کرنے والے (جو جہاد کا حق ادا

کرنے والے ہیں) اور ابھی اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کون ہیں تم میں سے جو واقعتاً صبر کرنے اور جھیلنے والے ہیں''۔

لفظ ''صابرین'' کو یہاں خاص طور پر نوٹ کیجئے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں قرآن حکیم کے جو مقامات آج کل ہمارے زیر مطالعہ ہیں وہ ''تواصی بالصبر'' ہی کی تفاصیل پر مشتمل ہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص﴾

''اور تم موت کی تمنا کیا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرتے''۔

یہاں اس جذبۂ شوقِ شہادت کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار بعض مسلمانوں کی طرف سے اس مشاورت کے دوران ہوا تھا جو آنحضور ﷺ نے غزوۂ اُحد سے قبل منعقد فرمائی تھی۔ آرزو کرنا اس وقت تک بہت آسان ہوتا ہے کہ جب تک موت سامنے نہ آ کھڑی ہو۔ لیکن جب موت سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو معاملہ بڑا مختلف ہوتا ہے۔

﴿فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

''تو اب تم نے اس موت کو دیکھ لیا ہے اور اس سے آنکھیں چار کر لی ہیں''۔

مسلمانوں کے لئے تنبیہہ

اگلی آیت میں قدرے تنبیہہ کا انداز ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ﴾ اور اے مسلمانو! یہ تمہیں کیا ہوا تھا کہ آنحضور ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر تمہاری ہمتیں جواب دے گئیں! تمہارا تعلق محمد (ﷺ) سے ہے یا اللہ سے ہے؟..... تمہیں سوچنا چاہئے کہ تمہارا تعلق تو اللہ کے ساتھ ہے جو سب کا خالق و مالک ہے۔ ''محمد ﷺ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہیں''۔ ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ﴾ ''ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں۔ تو کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے''۔ ﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ گیا تو وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا''۔ ﴿وَسَيَجْزِي اللّٰهُ

الشّٰكِرِيْنَ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کو (حق ماننے والوں کو) عنقریب جزا عطا فرمانے والا ہے''۔

یاد رہے کہ یہی وہ آیت ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلاوت فرمائی تھی حضور ﷺ کے انتقال کے وقت' جبکہ نبی اکرم ﷺ سے جدائی کا صدمہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ اس صورتِ حال سے اس درجے متأثر تھے کہ ننگی تلوار لے کر بیٹھ گئے کہ جس نے کہا کہ محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جلالِ فاروقیؓ کے سامنے کسی کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ ہاں' یہ ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ ہی تھے کہ جنہوں نے اس صورتِ حال کو سنبھالا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے' سیدھے حجرۂ عائشہؓ میں گئے' بیٹی کا گھر تھا' جاتے ہی آنحضور ﷺ کی پیشانی سے چادر ہٹائی' بوسہ دیا' واپس آئے اور پھر خطبہ دیا:

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ ' وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ

''لوگو! جو کوئی بھی محمد کی پرستش کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد کا انتقال ہو گیا (ﷺ) اور جو کوئی اللہ کا پرستار ہے' اللہ کی پرستش کرنے والا ہے' اسے مطمئن رہنا چاہئے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے جس پر کبھی موت وارد ہونے والی نہیں''۔

یہ اصولی بات ارشاد فرمانے کے بعد آپؓ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۗىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی گردن جھکتی چلی گئی اور آپؓ نے تلوار کو نیام میں ڈال لیا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے۔

اب اگلی آیت کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا

بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ کسی ذی نفس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر اس کی موت واقع ہو جائے۔ ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ﴾ وہ تو ایک معیّن وقت ہے جو لکھ دیا گیا ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ تو اس مہلتِ عمر میں کہ جو انسان کو ملی ہے' جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہے' جس کی سعی و جُہد محض اس دنیا کے لئے ہے' اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں' مال و اسبابِ دُنیوی میں سے کچھ اسے عطا کر دیتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ اور جو کوئی آخرت کا طالب ہے' جس کے پیشِ نظر اپنی جدوجہد کا وہ نتیجہ ہے کہ جو آخرت میں نکلنے والا ہے تو ہم اسے اس میں سے عطا فرمائیں گے' اس کے لئے آخرت کا اجر محفوظ ہوگا۔ ﴿وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴾ اور ہم بہت جلد شکر کرنے والوں کو بدلہ عطا کریں گے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ﴾ اور کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں کہ بہت سے اللہ والوں نے ان کے ساتھ ہو کر جنگ کی ﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ﴾ تو اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں بھی اُن پر آئیں اس پر وہ بددل نہیں ہوئے' سُست نہیں پڑے' انہوں نے تکالیف کے مقابلے میں کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ تو ایسے ہی صبر کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کی محبوبیت کا مقام تو انہی کو حاصل ہوتا ہے جو ہر چہ باداباد کی کیفیت سے اللہ کی راہ میں ڈٹ جانے والے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ﴾ اور ان کی بات تو بس یہی تھی' ان کی عرض داشت تو بس اتنی تھی کہ وہ یہ التجا کرتے رہے کہ اے ہمارے ربّ! ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ ﴿وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا ﴾ اور ہم سے اپنے معاملات میں جو بھی زیادتی ہوئی ہے اس کو بخش دے ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ﴾ اور ہمارے قدموں کو جما دے ﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ اور ہمیں کافروں پر فتح عطا فرما۔ ﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے

انہیں دنیا کا بدلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ بدلہ دیا۔ ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ اور اللہ ایسے ہی احسان کرنے والوں سے' حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد کے حالات پر جو طویل تبصرہ قرآن حکیم میں وارد ہوا ہے ان میں سے چند آیات کا ہم نے سطورِ بالا میں مطالعہ کیا ہے جس سے اس بات کی طرف واضح رہنمائی ملتی ہے کہ اہل ایمان کو ابتلاؤں اور آزمائشوں سے دوچار کرنے کی اصل حکمت کیا ہے۔ اور وہ حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کی چھانٹی ہو جائے' سچے مسلمانوں اور نام نہاد مسلمانوں کے درمیان تمیز ہو جائے' پھر یہ کہ یہ آزمائشیں اہل ایمان کی مزید تربیت کا ذریعہ بھی بنتی ہیں کہ آزمائش کی ان بھٹیوں سے گزر کر تو کندن بن کر نکلو۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ حالات کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ وہ چاہتا تو تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچتی' کوئی تمہیں گزند نہ پہنچا سکتا' لیکن پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ تمہاری صفوں میں ابھی کہاں کہاں کمزوری موجود ہے۔ تمہاری جمعیت کے اندر کون کون سے گوشے ایسے ہیں کہ جہاں ابھی مزید استحکام کی ضرورت ہے۔ آئندہ کے کٹھن تر مراحل سے نبرد آزما ہونے کے لئے تمہارا اپنی تمام کمزوریوں پر متنبہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تبھی تمہارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ اپنی صفوں کو از سرِ نو ترتیب دے کر انہیں تطہیر کے عمل سے گزار سکو اور اس طرح اپنی ہمت کو مجتمع کر کے آئندہ آنے والے مراحل کے لئے مناسب تیاری کر سکو!

غزوۂ احزاب کا پس منظر

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' غزوۂ اُحد کے بعد صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ اُحد کے میدان میں مسلمانوں کو جو دھچکا لگا تھا اس سے طبعی طور پر مسلمانوں کی ہمتیں کچھ پست ہوئیں اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر کچھ مزید تیاری کے ساتھ ایک مجتمع کوشش کی جائے اور مل جل کر زور لگایا جائے تو اس پودے کو اکھاڑا جا سکتا ہے' مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست دے کر یہ جھگڑا ہمیشہ کے

لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غزوۂ اُحد کے دو سال بعد ۵ ھ میں اسلام کے چراغ کو گل کرنے کی خاطر عرب کی پوری مشرکانہ قوت مجتمع ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئی۔ اس واقعے کو ہم غزوۂ احزاب کے نام سے جانتے ہیں۔ اسے غزوۂ احزاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جو لوگ حملہ آور ہوئے تھے وہ کسی ایک قبیلے یا کسی ایک گروپ سے متعلق نہیں تھے بلکہ بے شمار قبائل، جن میں عربوں کے علاوہ یہود کے قبائل بھی شامل تھے، متحد ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ وہ مشرق سے بھی آئے اور مغرب سے بھی آئے، ان علاقوں سے بھی آئے جو بلندی پر واقع ہیں اور اس جانب سے بھی آئے جو مدینہ کے مقابلے میں نشیب میں واقع ہے، کم و بیش بارہ ہزار کا لشکر جرار مسلمانوں کے خلاف مجتمع ہوا۔ ان حملہ آوروں میں بنو قینقاع بھی شامل تھے جو غزوۂ بدر کے بعد اپنی عہد شکنی کے باعث جلاوطن کئے گئے تھے، اور بنو نضیر بھی تھے کہ جنہیں ۴ ھ میں مدینہ سے نکال باہر کیا گیا تھا اور وہ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ مدینہ کے مشرق میں نجد کی طرف سے بنو غطفان چڑھائی کرتے ہوئے آئے جبکہ نیچے کی طرف سے یعنی مکّہ سے قریش کی فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ گویا آس پاس کے تمام مشرک قبائل مجتمع ہو گئے۔ مدینے کی چھوٹی سی بستی پر جس میں چند سو گھر آباد ہوں گے، اتنا بڑا حملہ ایک نہایت غیر معمولی بات تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں چٹیل میدان میں کوئی چراغ جل رہا ہو اور اس کو بجھانے کے لئے ہر طرف سے جھکڑ چل رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران مسلمانوں کی اجتماعی ابتلاء و آزمائش کے اعتبار سے یہ کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ اس موقع پر اہل ایمان کا ایمان پوری طرح آزما لیا گیا، اور جن کے دلوں میں نفاق کا مرض تھا ان کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی، جس کے نتیجے میں ان کا نفاق پورے طور پر ظاہر ہو گیا، وہ نفاق جو دلوں میں پوشیدہ تھا منافقین کی زبانوں پر جاری ہو گیا۔ بعد میں یہ غزوہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی اس انقلابی جدّوجُہد میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

غزوۂ احزاب کا ذکر قرآن حکیم میں

قرآن حکیم میں اس غزوے کا ذکر سورۃ الاحزاب کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں ہے۔ وہاں اس صورت حال کی مکمل نقشہ کشی کر دی گئی ہے کہ یہ موقع مسلمانوں کے لئے ابتلاء اور آزمائش کا نقطۂ عروج تھا۔ جس طرح ذاتی سطح پر طائف کے دن محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر مصائب اور تکالیف کا معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا' بعینہٖ اسی طرح کا معاملہ بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں کے لئے غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس غزوہ کا ذکر جن آیات میں آیا ہے ان میں سے چند آیات کا یہاں ترجمہ کر لینا مفید ہوگا تاکہ اس صورت حال کی صحیح تصویر خود آیاتِ قرآنی کے ذریعے سے ہمارے سامنے آ جائے جس سے اہل ایمان دوچار تھے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۝﴾ (آیت ۹)

اس پہلی آیت میں قرآن مجید نے اپنے مخصوص اسلوب کے مطابق اس پورے غزوے کے دوران جو حالات و واقعات پیش آئے اور اس کا جو نتیجہ نکلا ان سب کی طرف نہایت جامعیت کے ساتھ اشارہ کر دیا ہے:

''اے اہل ایمان! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم پر لشکر حملہ آور ہوئے تھے تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی اور ایسے لشکر بھیجے کہ جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے' اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے اسے دیکھ رہا تھا''۔

ابتلاء و آزمائش کا نقطۂ عروج

اگلی آیت سے صورتِ حال کی نقشہ کشی شروع ہوتی ہے: ﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ ذرا یاد تو کرو جب وہ لشکر تم پر حملہ آور ہوئے نیچے سے بھی اور اوپر سے بھی۔ مدینہ منورہ کے داہنی جانب کا علاقہ اونچا ہے اور بائیں جانب سے نیچائی ہے۔ بائیں طرف سے یعنی مغرب کی جانب سے جو لشکر آئے ان کے بارے میں فرمایا: ﴿مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ اور جو دائیں جانب سے آئے ان کے لئے یہاں ﴿مِنْ

فَوْقِكُمْ ﴾ کے الفاظ آئے۔ آیت کے اگلے ٹکڑے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزمائش کس درجے شدید تھی: ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ ﴾ اور جبکہ نگاہیں کج ہوگئی تھیں۔ ہم اپنے محاورے میں یوں کہیں گے کہ جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ ﴾ اور دل ہنسلیوں میں آکر پھنس گئے تھے۔ گویا خوف و دہشت سے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ ﴿وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ ﴾ اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے۔ طرح طرح کے وسوسے تمہارے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ نصرت کے وعدے کیا ہوئے؟ اللہ کی مدد کا وہ تاکیدی وعدہ کہاں گیا جو بار بار قرآن میں آیا ہے؟ وہ یقین دہانیاں جو ہمیں کرائی گئی تھیں کہ تمہیں غلبہ حاصل ہوگا' عرب اور عجم کے خزانے تمہارے قدموں میں آئیں گے' کیا وہ محض ہمیں دھوکہ دینے کے لئے تھیں؟ ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ ﴾ یہ وقت وہ تھا جبکہ اہلِ ایمان کی صحیح معنوں میں آزمائش ہوگئی اور انہیں ہلایا گیا بڑی شدت کا ہلایا جانا۔ حالات انتہائی نامساعد تھے۔ قحط کا وہ عالم کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ فصلیں تیار تھیں لیکن انہیں اجاڑ دیا گیا' ساری فصل دشمنوں نے تباہ کر دی۔ بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھ لئے گئے کہ فاقے کی وجہ سے کہیں کمر دوہری نہ ہو جائے۔ اس عالم میں خندق کھودی جا رہی ہے' پھاوڑے چل رہے ہیں۔ اُس وقت محمد ﷺ کے ساتھیوں کی زبان پر یہ ترانہ رواں ہے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''کہ ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد (ﷺ) کے ہاتھ پر بیعت کی ہے' اس بات کی بیعت کہ جہاد کرتے رہیں گے جب تک کہ جان میں جان ہے''۔

بہر حال' صورت حال اتنی خوفناک تھی اور ایسی تباہی نگاہوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی کہ بظاہر احوال خاتمہ یقینی نظر آتا تھا۔ بلاشبہ یہ سخت ترین آزمائش کی گھڑی تھی جس سے اہلِ ایمان دوچار تھے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

عصر حاضر میں مطالعۂ سیرتِ طیّبہ کی ضرورت واہمیّت

تحریر: پروفیسر محمد شریف ☆

سیرت کے لغوی معنی ہیں راستہ اور طریقہ۔ شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں آنحضور ﷺ کی زندگی کے مختلف گوشوں کی عملی تصویر کو سیرت کا نام دیا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ طیّبہ اور آپؐ کے احوالِ زندگی کا بار بار اور غور وفکر کے ساتھ عمیق مطالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے نہایت ضروری ہے بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی ایک فریضۂ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے تو یہ مطالعہ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہمیں کائنات کے خالق خدائے بزرگ و برتر نے اپنی کتاب میں یہی حکم دیا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں، ان کی اتباع کریں اور ان کے اُسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کے لئے نمونۂ عمل قرار دے کر اپنے آپ کو اِس رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں اور اسی میں ساری زندگی بسر کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جبکہ ہم آپ ﷺ کی سیرتِ طیّبہ سے واقفیت حاصل کریں، اسے بار بار پڑھیں، سنیں، دوسروں کو سنائیں، خود یاد رکھیں اور دوسروں کو یاد دلاتے رہیں۔ ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ ہم پر غفلت طاری ہو۔ رسول اللہ ﷺ سے محبّت اللہ سے محبّت ہے اور رسول اللہ ﷺ سے غفلت اللہ سے غفلت ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو گیا اسے نہ یہاں چین اور نہ وہاں چین۔

ایک غیر مُسلم کے لئے حضور ﷺ کی سیرتِ طیّبہ کا مطالعہ اس لئے ایک فریضۂ انسانی ہے کہ نوعِ انسانی میں مَردِ کامل کا صرف یہی ایک نمونہ ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اتباع کرے یا انکار، لیکن یہ جان لینا ہر آدمی پر فرض ہے کہ ہر پہلو سے کامران و

☆ شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج بھکر

کامیاب اور ہر اعتبار سے مکمل انسان کیسا ہوتا ہے!

آنحضور ﷺ صرف مسلمانوں کے لئے رسول نہیں ہیں کہ ان کو قومی ہیرو بنا کر پیش کیا جائے اور ان کے کارناموں کو قومی مفاخر سمجھ کر ان پر ناز کیا جائے' بلکہ وہ تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور ان کی سیرت کو اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ وہ تمام انسانوں کے دل و دماغ کو اپیل کرے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہ ہوگا کہ ہم رسول ﷺ کو اپنا قومی ہیرو بنالیں اور پھر نہ خود آپ ﷺ کی سیرت سے مستفید ہوں اور نہ دوسروں کو اس سے مستفید ہونے دیں' اور نہ دنیا کے انسانوں کے سامنے وہ نظامِ زندگی رکھیں جو حضور اکرم ﷺ لائے ہیں اور جس کو اختیار کرنے والوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابیاں ہی کامیابیاں ہیں اور جس سے انحراف کرنے کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی ناکامی ہے۔

رسول پاک ﷺ ایک ایسے مصلح نہیں جنہوں نے صرف اپنے زمانے میں دنیائے انسانیت پر اثرات ڈالے تھے اور اپنی پاک تعلیمات و سیرت سے نوع انسانی کی اصلاح کی تھی اور اس کے بعد وہ تاریخی شخصیت بن گئے' بلکہ وہ ایک ایسے مصلح اور ایک ایسے رسول ہیں جن کی اصلاحات تمام انسانوں کے لئے قیامت تک مفید اور ضروری ہیں اور جن کی راہنمائی سے کوئی شخص کبھی بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کو تمام مسلمان مانتے ہیں اور جانتے ہیں' مگر وہ آپ ﷺ کی سیرت کو اس انداز سے بیان نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہیں۔ آپ ﷺ کا لایا ہوا دین دنیا کے لئے خیر و برکت کا باعث ہے اور زندگی کا جو نمونہ آپؐ نے پیش فرمایا ہے اس میں تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کی تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت کے مطالعہ کی ضرورت ہمیں اور ساری دنیا کو اس لئے ہے کہ اس میں انسانیت کا بہترین نمونہ موجود ہے جسے سامنے رکھ کر تمام انسانوں کو انسانیت سیکھنا چاہئے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم میں ربّ العزت نے یوں اشارہ فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ .....﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونہ ہے''۔

حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والا کسی جگہ تاریکی کا نشان نہیں پاتا۔ ہر چیز واضح اور چمکتے آفتاب کی طرح روشن ہے۔ آپؐ کا شخصی کردار، رحمت، شفقت، خشیت، عبادت، شجاعت، عدالت، سخاوت، فراست، متانت، ایثار، احساس ذمہ داری، عاجزی اور تواضع، صبر، توکّل، ثبات اور دانش مندی وغیرہ سب کی کیفیت اور ان کے عملی نمونے مل جاتے ہیں، اور بہت سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کی گھریلو زندگی میں اچھے شوہر، اچھے باپ اور اچھے نانا وغیرہ کے بہترین نمونے ہمیں ملتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں اچھے دوست، اچھے ساتھی، شفیق سردار اور مساکین کے سرپرست و مددگار کا بہترین نمونہ ہمیں آپ ﷺ کی ذات میں ملتا ہے۔ اسی طرح قومی اور ملّی زندگی میں عدل و انصاف، فوجوں کی کمانداری، انتظاماتِ حکومت، رعایا پروری، سیاسی سمجھ بوجھ، دوستوں کی دلداری، دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا وغیرہ ایسا مکمل اور بہترین نقشہ ہمیں سیرتِ طیبہ میں دکھائی دیتا ہے کہ ویسا اور کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اور کمال یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے نمونے صرف ایک مقدس و مکمل انسان میں مل جاتے ہیں۔

مطالعۂ سیرتِ طیبہ کی ضرورت و اہمیت درج ذیل پہلوؤں سے مزید نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

۱) اللہ تعالیٰ کی پہچان

قرآن پاک کی سورۃ الفرقان میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ جب مشرکین سے کہا جاتا ہے کہ تم رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ پوچھتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ﴾ (آیت ۶۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے''؟

لہٰذا ہمارے لئے یہ اعتماد پیدا کرنا کہ خدا کون ہے، وہ کس طرح سے ہمارے لئے پہچان ہے، اس فلسفہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ کیا جائے کہ وہ ہمیں

کیا درس دیتی ہے۔ اور وہ درس یہی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.....﴾ (آل عمران: ۳۱)

''(اے نبی!) کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو پھر میری پیروی کرو اس کے نتیجہ میں اللہ تم سے محبت کرے گا''۔

۲) کتاب اللہ اور سنت نبویؐ میں تعلق

اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر حدیث نے کی اور حدیث پر حجیت کا حکم قرآن نے لگایا۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک ہیں' جیسے کشتی اور ملاح کا رشتہ۔ وہ لوگ جنہوں نے مجرد قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا فیصلہ کرلیا ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی مسافروں سے بھری ہو مگر ملاح کوئی نہ ہو۔ ایسی کشتی کا مقدر یقیناً ڈوبنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ حضور اکرم ﷺ نے واضح فرمایا:

((تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ ' لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ)) (موطا امام مالك)

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں' جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہوگے' اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت''۔

۳) عملی نمونہ

حضور پُرنور ﷺ کی آفاقی اور بین الکائناتی شخصیت ازلی و ابدی حقائق و معارف کی حامل ہے۔ لسانِ وحی میں کامل و اکمل ہے۔ محبوبِ خالق کون و مکان' قاسم علم و عرفان' حامل فرقان دو جہان' محبت کا جوہری' راحتِ قلوب عاشقان' اخلاص کا مشتری' لسان یزداں' صبر کا معدن اور درد مندوں کا درماں' یعنی زندگی کے تمام معاملات میں قسام ازل نے آپ کی ذات مبارکہ کو تمام انسانیت کے لئے ابدالاباد تک نمونہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا آپؐ کی پیشوائی سے مستفید ہونے کے لئے آپؐ کی سیرت کا مطالعہ ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.....﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''یقیناً تمہارے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔

ارشادِ نبویؐ ہے:

((کُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ اَبٰی)) قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَنْ یَّاْبٰی؟ قَالَ: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی))

(صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

''میری تمام اُمت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جو انکار کرے''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کون انکار کرے گا؟ فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے (گویا جنت میں جانے سے) انکار کیا''۔

۴) بحیثیتِ مفسّرِ قرآن

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیّبہ قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ قرآن پاک میں جو احکام آئے آپؐ نے ان کو عملاً کر کے دکھایا۔ قرآن حکیم آپؐ پر نازل ہوا تھا اس لئے سب سے اعلیٰ اور صحیح اور مستند فہم القرآن آپؐ ہی کا ہے۔ حدیث و سیرت اپنی اصل حیثیت میں قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی تفسیر ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے آپ ﷺ کی تشریحات کا سہارا ناگزیر ہے۔ قرآن مجید پہنچانے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور فعل سے کتابِ الٰہی کی تشریح کریں، اور اس کی ایک ایک آیت کا صحیح منشا سمجھائیں۔ آپ ﷺ کی اس ذمہ داری کو خود قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ .....﴾ (النحل: ٤٤)

''اور ہم نے آپؐ کی طرف قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت فرمائیں جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے''۔

سورۂ آلِ عمران میں اسی بات کو زیادہ صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ (آل عمران: ١٦٤)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر احسان کیا جب اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

قرآن حکیم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ رسول پاک ﷺ کی ذمّہ داری اللہ تعالیٰ کی آیات کو دوسروں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آپؐ ان آیات کی تعلیم بھی دیں' اور تعلیم محض الفاظ سنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم کا عمل مشکل مطالب کی وضاحت اور مجمل ومبہم باتوں کی تفصیل اور تشریح کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ تعلیم کبھی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی عمل سے' اور کبھی زبان وعمل دونوں سے ہوتی ہے۔ اور یہی وہ تعلیم کتاب وحکمت ہے جو احادیث کے نام سے مشہور رہے۔ احادیث کی جتنی ضرورت رسول پاک ﷺ کی زندگی میں تھی اتنی ہی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

سیرت نبوی کے بغیر کلام ربانی کی تفہیم اور اس پر عمل ممکن نہیں۔ مثلاً نماز کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) (بخاری)

''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''۔

ا) لہٰذا نماز کی ادائیگی کے لئے جس قدر تفصیلات درکار ہیں وہ سب کی سب احادیث نبوی میں ملتی ہیں۔

ب) صوم' زکوٰۃ اور حج کے احکام وضروری مسائل کی تمام تر تفصیلات وتشریحات احادیث مبارکہ سے ملتی ہیں۔

ج) اشیاء کی حلت وحرمت' تعزیرات' سود' طہارت وپاکیزگی اور دیگر احکامات کی تشریح وتفصیل کا پتہ احادیث سے ملتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

''اگر حدیث میسر نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کو نہ سمجھ سکتا''۔

۵) شارع اور قانون ساز

حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو

شارع قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں آپؐ کو تشریعی اختیارات عطا کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اہل اسلام کو حکم دیا ہے کہ پاک اور حلال چیزیں کھاؤ اور ناپاک اور حرام چیزیں نہ کھاؤ۔ چند چیزوں کی بابت یہ بتایا گیا کہ یہ حرام ہیں اور مزید تشریع (قانون سازی) یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ پر چھوڑ دی گئی:

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ .....﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''اور رسولؐ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے''۔

چنانچہ آنحضور ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ مزید کون سی چیزیں حرام ہیں۔

اسی طرح قرآن حکیم میں یہ تفصیل بتاتے ہوئے کہ فلاں فلاں رشتہ کی عورتوں سے نکاح حرام ہے' فرمایا گیا: ﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ یعنی دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ اس کے بعد کہہ دیا گیا:

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ.....﴾ (النساء:۲۴)

''اور حلال ہیں تمہارے لئے جو اِن کے سوا ہیں''۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ جس طرح دو بہنوں کو نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا اسی طرح پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ.....﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''آپ انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں''۔

۶) قاضی و منصف

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آپؐ کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے قاضی و منصف بنایا ہے۔ کوئی مسلمان آپؐ کے صادر کردہ فیصلوں سے سرتابی نہیں کر سکتا' بلکہ ایسا کرنا کفر ہے' اور ویسے بھی میدان قضا میں آپؐ کی رہبری کے بغیر کتاب الاقضیہ مکمل نہیں ہوتی۔ فرقان مجید کی درج ذیل آیات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ .....﴾ (النساء:۶۵)

ومربّی ہونا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم اور مثالی معلّم ومربّی بن کر تشریف لائے۔ ایک معلّم کے لئے سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ خود بھی معلّم تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

((اِنّما بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) (سنن ابن ماجه والدارمی)

''مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔

پھر فرمایا:

((اِنّما بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلاقِ)) (موطا امام مالك)

''مجھے اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے''۔

آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آپؐ نے اپنی دعوت اور جدوجہد کا کس صبر وتحمل سے آغاز کیا' کیونکر تہذیب وتمدن اور علم واخلاق کو پھیلایا' کیونکر ملکوں اور قوموں کو ایک بنایا' کیونکر امیری وغریبی کے امتیازات کو مٹایا اور طاغوت کا سر جھکایا تو صراطِ مستقیم انسانیت نے پایا۔

۹) عظیم انقلابی رہنما

رسول مکرم ﷺ کے آنے سے پہلے انسانیت سسکیاں لے رہی تھی' آدمیت دم توڑ رہی تھی' شرافت ونجابت پر جور وستم کے پردے چھا گئے تھے۔ طاغوتی طاقتیں انسانی اقدار کو پامال کر رہی تھیں۔ ابلیس آدمیت کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ نیکی نفس کی طغیانیوں میں گھری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس ناگفتہ بہ حالت میں رحمتِ حق جوش میں آئی۔ اور ۱۲ ربیع الاوّل کو سرزمین مکّہ سے وہ عظیم انقلابی رہنما متولّد ہوا کہ جس کی ولادت کے ساتھ ہی کفر وشرک کے محلّات دھڑام سے زمین پر آ گرے۔ فتنہ وفساد کی آگ یک لخت بجھ گئی اور دربارِ نبوت میں عدی طائی' ابوسفیان اموی' صہیب رومی' سلمان فارسی' ابوذر غفاری اور بلال حبشی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آنے لگے۔

تاریخ انسانی کا یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس کی نظیر نہ ماضی میں تلاش کی جا سکتی ہے اور نہ آئندہ کبھی دنیا پیش کر سکے گی۔ سر ولیم میور لکھتا ہے:

''پس قسم ہے آپؐ کے ربّ کی! وہ اُس وقت تک مؤمن نہ ہوں گے جب تک آپ کو منصف نہ بنائیں اس جھگڑے میں جو اُن کے درمیان اٹھے''۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.....﴾ (النساء:۵۹)

''پھر اگر کسی معاملہ میں تنازعہ ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو''۔

۷) بطورِ فرماں روا

قرآن مجید کی متعدد آیات بتاتی ہیں کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہیں۔ یہ منصب آپؐ کو بحیثیت رسول حاصل ہوا ہے۔ بطورِ حاکم آپ کی اطاعت عینِ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ ایک طویل حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے آپؐ کو اُس شخص سے تشبیہ دی ہے جو دشمن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی قوم کو ہوشیار کرتا ہو کہ یہاں سے چلو ورنہ دشمن حملہ آور ہونے والا ہے' تو جو چل پڑے وہ نجات پا گئے اور جو رہ گئے وہ مارے گئے۔ خلاصہ یہی ہے کہ آپ ﷺ کی فرماں برداری میں نجات اور نافرمانی میں ہلاکت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

پھر فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ۝﴾ (محمد:۳۳)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال برباد نہ کرو''۔

اُسوۂ حسنہ کی پیروی اور ان تمام آیات کے منشاء پر عمل صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب آپؐ کے اعمال و افعال اور سیرتِ طیبہ ہمارے سامنے موجود ہو۔

۸) بحیثیت معلّم و مربّی

آنحضور ﷺ کی سیرتِ پاک کے دوسرے تمام پہلوؤں کی طرح آپؐ کا معلّم

"The success that attended the mission of the Prophet of Islam has no parallel in history."

۱۰) معیارِ کاملیّت

کسی بھی انسانی سیرت کے دائمی نمونہ عمل بننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے صحیفۂ حیات کے تمام حصّے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں' کوئی واقعہ پردۂ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں گم نہ ہو۔ اگر یہ دعویٰ کر دیا جائے تو حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کاملیت کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ مائنک جی ڈھلہ ''تاریخ زرتشت'' میں لکھتے ہیں:

"We know something of Budhh and Jesus but we know practically nothing of Zarastav, We know every thing of the life of Muhammad."

۱۱) جامعیّت

جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لئے جن نمونوں کی ضرورت ہے وہ سب اس آئیڈیل زندگی کے اندر موجود ہوں اور یہ مقصد صرف خاتم الانبیاء ﷺ کی سیرت سے پورا ہوتا ہے۔ سیّد سلیمان ندویؒ کے بقول ''آپؐ کی ذاتِ مبارکہ میں تمام انبیاء کے اوصاف سمٹ کر آ گئے تھے''۔ ارشاد نبوی ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً))

''ہر نبی ایک خاص قوم کی طرف مبعوث کیا گیا جب کہ میں تمام انسانوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

۱۲) عملیت

''آئیڈیل لائف'' کا سب سے آخری معیار عملیت ہے۔ عملیت سے مقصود یہ ہے کہ شارع دین اور بانیٔ دین و مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو قابل عمل ثابت کیا ہو۔ انسانی

سیرت کے بہتر ہونے کی دلیل اور کامل ہونے کی سند یہی ہے اور یہ آپ ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ارشادِ محبوب خداوندی ہے:

((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ)) (سنن ابن ماجه)

''تم پر میرے طریق کار اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا لازم ہے''۔

اور فرمایا:

((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) (بخاری)

''نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔

۱۳) اتحادِ اسلامی کی ضمانت

اگر ہر شخص باری تعالیٰ کے احکام پر اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق کام کرنا شروع کر دے تو اُمّت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور قوم شدید انتشار کا شکار ہو جائے' مثلاً اگر صرف قرآن مجید کی رو سے نماز جمعہ کا فیصلہ کرنا ہو کہ جمعہ فرض ہے یا واجب' سنّت ہے یا مستحب' اس کی کتنی رکعتیں پڑھی جائیں وغیرہ۔ سنّت رسول اللہ ﷺ کے بغیر صرف ایک معاملہ میں ہر شخص کی سوچ کا انداز اور طریق الگ ہو گا۔ اور یہ مختلف سوچ اور طریق کا انداز اتحادِ اُمت میں رخنہ پیدا کر سکتا ہے۔

۱۴) وحی غیر متلوّ

قرآن حکیم وحی متلو ہے' یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے' جبکہ ارشاد نبویؐ وحی غیر متلو ہے' یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی والہام کے تحت ہی تھا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝﴾ (النجم:۳'۴)

''نبی اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں کہتا' بلکہ وہ تو ایک وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے''۔

تاریخی حیثیت

تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کے اہم ترین دَور یعنی رسالت مآب ﷺ کے

دورِ مسعود میں ہونے والے واقعات کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ سیرت و مغازی اور اس دَور کی تاریخ کی کتابیں احادیث کے مطالعہ سے ہی مرتب ہوئی ہیں۔ اگر ہم حدیث کو چھوڑ دیں تو اس اہم ترین عہد کے بارے میں تاریکی میں پڑ جائیں گے۔ پھر اس دور کے کئی واقعات کی طرف قرآن حکیم میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ اگر سیرتِ طیبہ کا مطالعہ نہ ہو تو یہ تاریخی تلمیحات ہمارے لئے معمہ بن جائیں گی۔

اصلاحِ معاشرہ اتّباعِ اخلاقِ محمدیؐ کے بغیر ناممکن ہے

انسانی معاشرت، اسلامی ریاست اور اسلامی معیشت کی بنیاد ہی اخلاق و ایمان پر ہے۔ پورے دین کی غرض و غایت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ بنی نوعِ انسان کے اخلاق پاکیزہ ہو جائیں۔ اگر انسان کے اخلاق درست ہو جائیں تو پھر صحت مند معاشرہ کے قیام میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کے اخلاق و عادات پاکیزہ کرنے کے لئے سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ پاکیزہ اخلاق اور عمدہ کردار کی تشکیل میں سیرتِ محمدیؐ جزو لاینفک ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ

سیرتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کا طرزِ عمل

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو آپؓ پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کرتے، اگر وہاں نہ ملتا تو سنّت رسولؐ میں اس کی نظیر تلاش کرتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل بھی احادیث کے بارے میں وہی تھا جو حضرت ابوبکرؓ کا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، لیکن ابوسعید خدریؓ کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرا شوہر قتل ہو گیا تھا، میں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ

نے شوہر کے مکان پر عدّت گزارنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس روایت کے مطابق فیصلہ کیا۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند مرتد لائے گئے تو آپؓ نے ان کو جلانے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے حدیث پیش کی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''کسی کو آگ کا عذاب نہ دو''۔

حضرت علیؓ نے سن کر فرمایا: ''ابنِ عباس سچ کہتے ہیں''۔

ائمہ اربعہ اور سیرتِ طیّبہ

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

''میرے قول کو حدیثِ نبوی اور قولِ صحابہ کی موجودگی میں ترک کر دو''۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دین کے معاملہ میں آپ ﷺ کا محتاج بنایا ہے۔''

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

''میں ایک انسان ہی ہوں، غلط اور صحیح دونوں قسم کے فتوے دے سکتا ہوں۔ میری رائے میں غور کرو، اگر کتاب وسنّت کے مطابق ہو تو اسے قبول کرو ورنہ ردّ کر دو''۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

''جس نے رسولِ پاک ﷺ کی حدیث کو ردّ کیا وہ ہلاکت و تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا''۔

صاحب سیرتِ طیّبہ غیر مسلم مفکّرین کی نظر میں

۱) ڈاکٹر ڈی رائٹ: ''محمد (ﷺ) اپنی ذات اور قوم کے لئے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کے لئے ابرِ رحمت تھے۔ تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں جس نے احکامِ خداوندی کو اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو''۔

۲) سر ولیم میور: ''اہلِ تصنیف محمد (ﷺ) کے بارے میں ان کے چال چلن کی

عصمت اوران کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہلِ مکّہ میں کمیاب تھی' متفق ہیں''۔

۳) پنڈت امرناتھ زرتشی دیال: ''سیرتِ نبوی کو بنظرِ غور دیکھنے سے یہ بات بآسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ پیدائش سے لے کر وفات تک ہر حال میں آنحضرت (ﷺ) کو تائید غیبی حاصل رہی ہے جو کہ لازمۂ نبوت ہے''۔

۴) سردار جوند سنگھ: ''دنیا میں آنحضرت رسول عربی پاکیزہ زندگی کی بے نظیر مثال ہیں''۔

۵) ڈاکٹر کلارک: ''حضرت محمد (ﷺ) کی تعلیمات کو ہی یہ خوبی ملی ہے کہ اس میں وہ تمام اچھی باتیں موجود ہیں جو دیگر مذاہب میں نہیں پائی جاتیں''۔

۶) میو جان: ''انسان جس قدر زیادہ محمد (ﷺ) کی سیرت پاک سے مطلع ہوگا وہ آپ کے ساتھ گزشتہ اور موجودہ انسانوں کی عقیدت مندی کے اسباب کو بھی پورے طور پر محسوس کرے گا' لوگوں کی آپ (ﷺ) کے ساتھ وجہ الفت و محبت جان جائے گا اور آپ کی عظمت اور قدر و منزلت سے بھی واقف ہو جائے گا''۔

۷) ڈاکٹر ای اے فریمن: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد (ﷺ) بڑے پکے اور سچے راست باز ریفارمر تھے''۔

خلاصۂ کلام

آخر میں یہ بات قابلِ توجّہ ہے کہ آج کا انسان مسلمان ہو یا غیر مسلمان' ایک طرف تو متضاد و متعارض انتہا پسندانہ سیاسی اور معاشی افکار مثلاً سرمایہ داریت اور اشتراکیت' قومیت اور جمہوریت وغیرہ کے درمیان ذہنی خلفشار کا شکار ہو رہا ہے' دوسری طرف مشینی اور صنعتی آسائشوں نے اسے مادی لذت کا پرستار بنا دیا ہے' تیسری طرف بڑی طاقتوں کے تباہ کن اسلحہ اور اپنی اپنی طاقت کے نشے نے پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر رکھا ہے اور ان سب چیزوں نے مل کر آج کے انسان کو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان سے محروم کر رکھا ہے۔ آنحضور ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کی عملی سیرت کے مطالعے میں ان تمام عوارض کا علاج اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل موجود ہے۔ آج دنیا جس امن و امان اور نجات و سلامتی کے حصول کے

لئے مضطرب ہے وہ اسلام میں قرآن کے پیغام اور صاحب قرآن کے عملی نمونہ کی صورت میں موجود ہے۔

اب مسلمانوں کو نہ صرف خود اپنے نبی کی سیرت کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ آنحضور ﷺ کی تعلیمات اور ان کے عملی نمونے یعنی سیرت النبیؐ کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ آنحضور ﷺ کے پیغام اور عملی کام سے متعارف ہونے کی اور دنیا کو اس سے متعارف کرنے کی ضرورت ہے۔ اب یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ اور جدید ترین عملی و تحقیقی اسلوب میں دنیا کو سیرتِ طیبہ سے روشناس کرائیں۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں لوگ اسلام کی حقانیت پر دو وجہ سے ایمان لائے تھے' قرآن سن کر یا نبی ﷺ کی سیرت دیکھ کر۔ آج بھی صحیح اور حقیقی اسلام کو سمجھنے اور دنیا کو اسلام کا اصل روپ دکھانے کے لئے ان ہی دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

مراجع ومصادر

۱) القرآن الحکیم
۲) تاریخ اسلام' از شاہ معین الدین ندوی
۳) الرحیق المختوم' از صفی الرحمٰن مبارک پوری
۴) رحمۃ للعالمین ﷺ' از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری
۵) سیرت النبی ﷺ' از سیّد سلیمان ندوی
۶) سیرتِ طیبہ' کوڈ نمبر ۴۳۶' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
۷) کمال نطق' از علامہ منظور احمد جعفری
۸) نقوش رسول نمبر' جلد چہارم
۹) ماہنامہ ''افکار معلّم''، نومبر ۱۹۹۴ء (مضمون: سیرت رسول ﷺ اور ہم' از سید حامد علی)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

نماز — مؤمن کی معراج

تحریر: حافظ محمد سلیمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ پاک ﷺ حجرۂ مبارک میں تشریف فرما ہوتے' باتیں ہو رہی ہوتیں' ایسے میں جب نماز کا وقت آ جاتا' آپؐ اذان سنتے تو یک بیک کیفیتِ مبارکہ یہ ہو جاتی گویا ہمارے ساتھ' بلکہ کسی کے ساتھ بھی' کوئی جان پہچان ہی نہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب کوئی مشکل درپیش آ جاتی تو آپؐ پہلا کام یہ کرتے کہ نماز ادا فرماتے کہ نماز ہی آپؐ کے لئے راحتِ جاں تھی۔ مسجدِ نبوی کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد ہوتا: ''اَرِحْنَا یَا بِلَالُ'' (بلال! نماز کے لئے بلاوا دے کر ہمیں راحت دو!) یہ تو آپؐ کے احوالِ عالیہ کا ذکر ہے کہ نماز کیفِ حضوری کا ذریعہ' حل مشکلات کا وسیلہ' آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحتِ جاں ذاتِ مبارکہ کے لئے تھی۔ عام مؤمنوں کے لئے بھی ارشاد ہوا ''نماز بندے اور اس کے ربّ کے درمیان سرگوشی ہے''۔ اذان میں نماز کو فلاح قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا کہ بندہ خدا سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں اپنا سر خم کر رہا ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ارشاد ہوا:

((اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ))

''نماز مؤمنوں کے لئے معراج کا درجہ رکھتی ہے''۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا
عجب نسبت ہے بندے میں' خدا میں!

بندے اور خدا میں نسبت کا حال واقعی عجب ہے۔ یہ سب سے قدیمی (عہدِ اَلَست والی) اور سب سے پائیدار (ابدالاباد تک قائم رہنے والی) واحد نسبت ہے۔ یہ نسبت

ربوبیت اور عبدیت کی تو ہے ہی' اس کے ساتھ ساتھ یہ نسبت اپنائیت کی' معیّت کی اور قربت کی بھی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط﴾ (البقرة:١٨٦)

''جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں تو کہہ دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں''۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ کتنا قریب؟ اس کا جواب یوں دیا گیا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (ق:١٦)

''اور ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں''۔

انسان جتنا زیادہ خدا رسیدہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کی قربت کو' معیّت کو' حضوری میں ہونے کو محسوس کرتا ہے۔وہ ہر وقت خدا کو اپنے ساتھ محسوس کرتا ہے۔غارِ ثور میں' سفرِ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صدّیقِ اکبرؓ سے فرمایا تھا:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ج﴾ (التوبة:٤٠)

''غم نہ کرو' یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔

جیسے بچّہ ہر وقت ماں کی نگاہوں میں ہوتا ہے اور وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہے' اس کا تحفظ کرتی ہے' اس سے بے حد و حساب زیادہ خیال خدا اپنے بندوں کا رکھتا ہے۔ حضور ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا......﴾ (الطور:٤٨)

''اپنے ربّ کے حکم کے لئے صبر کیجئے! آپؐ تو (ہر وقت) ہماری نظر میں ہیں''۔

میر ولی الدّین اپنی کتاب ''قرآن اور تعمیرِ سیرت'' میں ''قرآن اور علاجِ خوف'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی۔خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے' حضور و معیتِ حق کا ادراک کرتے اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں' دیکھ رہے ہیں' جھومتے اور رقص کرتے''۔

احساسِ معیّتِ الٰہی کا یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ بہرحال انسان کی تخلیق اسی لئے

ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ''یومِ اَلَست'' کو کئے گئے عہد کا ایفا کرے اور خدا کے ساتھ عبدیت کا رشتہ استوار کرے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت:۵۶)

''میں نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لئے پیدا فرمایا ہے''۔

افسوس! صد افسوس! صد ہزار بار افسوس! کہ ہم عارضی انسانی رشتوں اور فانی اشیاء کے جھمیلوں میں اتنا کھو جاتے ہیں' زندگی کی بھیڑ میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں اور ہماری حالت اس بچّے کی سی ہو جاتی ہے جو میلے کی گہما گہمی' رونق اور تماشوں میں اتنا محو ہو جائے کہ باپ کی انگلی چھوڑ دے' پھر اسے اپنے گھر کا راستہ یاد نہ آئے اور وہ پریشان حال اور آشفتہ خاطر پھرے۔

اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد:۲۸)

''دل تو اللہ کی یاد ہی سے اطمینان پاتے ہیں''۔

جو آدمی خدا کو بھلا بیٹھے' غفلت میں مبتلا ہو جائے' اس کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا.....﴾ (طٰہٰ:۱۲۴)

''جو میری یاد سے مُنہ پھیرے اس کے نصیب میں آشفتہ حال زندگی ہی ہوتی ہے''۔

اور ایسی زندگی کس کام کی؟ بقولِ شاعر۔

زندگی دل کا سکوں چاہتی ہے
رونقِ شہرِ سبا کیا دیکھیں!

اور دل کا سکون تو اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس میں صرف اور صرف خدا کی یاد ہو۔ کسی عارف نے کیا خوب کہا ہے:

''خوب سن لو کہ دلوں کو چین اور اطمینان صرف اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی میسر ہوتا ہے۔ پس قلب ایک شاہی محل ہے جس میں صرف شہنشاہِ حقیقی ہی سکونت کر سکتا ہے۔ دل کوئی بھٹیار خانہ تو نہیں کہ جس کو چاہو ٹھہرا لو۔ اگر ٹھہراؤ گے تو اس کے نزدیک ظالم اور گستاخ سمجھے جاؤ گے''۔

بندہ ہونے کی حیثیت سے ہماری سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم غفلت سے بچیں' اللہ کو یاد رکھیں' اسے یاد کریں (ذکر کے یہ دونوں معانی ہیں) اور سب کچھ بھول جائیں تو بھول جائیں مگر اللہ کو کبھی نہ بھولیں۔ حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

جندے نیں تینوں ربّ نہ بُھلّے' دعا فقیراں ایہا
ربّ نہ بُھلّے ہور سب کچھ بُھلّے' ربّ نہ بُھلّن جیہا

''میری پیاری جان! فقیروں کی دعا تو یہی ہے کہ تجھے ربّ نہ بھولے۔ اور سب کچھ بھول جائے تو بھول جائے' لیکن خدا نہ بھولے (کیونکہ) خدا بھولنے کی چیز نہیں ہے''۔

حضرت خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ نے غفلت سے بچنے کی تلقین یوں فرمائی:

خاموش فرید اسرار کنوں
چپ بے ہودہ گفتار کنوں
پر غافل تھی نہ یار کنوں
ایہو لاریبی فرمان آیا!

''فرید! بھید کی باتیں بیان کرنے سے باز ہی رہو اور بے ہودہ گفتار کرنے سے گریزاں رہو۔ لیکن بہر حال دوست (خدا) کی یاد سے غافل نہ رہو۔ بے شک حکم اسی بات کا دیا گیا ہے''۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے وردِ زبان اکثر یہ شعر رہتا۔

کسے کو غافل از حق یک زماں است
دراں دم کافر است اما نہاں است

''جو شخص ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے غافل ہو جاتا ہے وہ اُس وقت کفر (نافرمانی) کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' اگرچہ یہ کفر بظاہر نظر نہیں آتا''۔

باب الاسلام سندھ کے ہفت زبان صوفی شاعر حضرت سچل سرمست رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

جو دم غافل سو دم کافر سانوں ایہہ فرمایا

''ہمیں یہی حکم کیا گیا ہے کہ جو سانس بھی غفلت میں گزرے وہ حالت کفر (نافرمانی) میں گزرتی ہے''۔

نماز کیا ہے! غفلت کی بیماری کا ایک شافی' مجرب اور تیر بہدف علاج ہی تو ہے۔ نماز ذکر ہی تو ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ (طٰهٰ:١٤)

''میرا ذکر کرنے کے لئے نماز قائم کیا کرو''۔

نماز اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی' یاد رکھنے کی بہترین ضمانت ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا: ''اگر کسی کے دروازے کے آگے سے نہر بہتی ہو اور وہ اس میں پانچ مرتبہ روزانہ غسل کرے تو کیا اُس (کے جسم) پر کوئی میل باقی رہ جائے گی؟'' عرض کیا گیا: ''جی نہیں''۔ ارشاد ہوا: ''اسی طرح نماز کا حال ہے''۔ گویا دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنے سے اتنی ہی بار روحانی غسل ہو جاتا ہے۔ اور روح پر سے غفلت کی میل کچیل دُور ہو جاتی ہے۔

روزانہ آٹھ پہروں میں وقفے وقفے سے پانچ بار خدا کا بلاوا آتا ہے۔ یاددہانی ہوتی ہے کہ دنیا کی گہما گہمی میں اپنے خدا کو نہ بھول جاؤ' غفلت میں نہ پڑ جاؤ' اپنے اصلی اور دائمی گھر کو فراموش نہ کردو' عارضی اور وقتی پڑاؤ کو منزل نہ سمجھ بیٹھو۔ نماز تو گویا ایک کھڑکی ہے جو اِس دنیا کی تنگ و تاریک کوٹھڑی سے خدا تعالیٰ کے وسیع' روشن اور پُر رونق صحن میں کھلتی ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

دوزخ است آں خانہ کو بے روزن است
اصلِ دین اے بندہ روزن کردن است!

''ایسا گھر جس میں ایک بھی کھڑکی نہ ہو' دوزخ ہی تو ہے۔ دین کی اصلیت اور حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ حیاتِ مستعار کے عالمِ تنگ و تاریک سے حیاتِ اُخروی کے وسیع ترجہان کی جانب ایک کھڑکی کھول دی جائے''۔

یوں بھی ایک فانی انسان کو زیب نہیں دیتا کہ اس دوروزہ زندگی پر غرّہ کر کے خدا سے غافل ہو جائے۔ آدمی تو پانی کا بلبلہ ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

حیاتِ دُنیوی کی ناپائیداری کے بارے میں کسی نے کہا تھا:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا!

کچھ مضامین ہیں جن کی قرآن مجید میں بہت زیادہ تکرار کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک انسانی زندگی کی فنا پذیری ہے۔ مثلاً قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین بار آئے ہیں:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران:۱۸۵)، (الانبیاء:۳۵)، (العنکبوت:۵۷)

''ہر جان موت کا ذائقہ چکھ کر رہے گی''۔

کسی پنجابی شاعر نے کم وبیش اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

''اوڑک ٹٹناں ایس پتنگ نیں بھاویں چڑھ جاوے اسماناں نوں!''

''یہ پتنگ خواہ اتنی بلند اڑے کہ آسمان تک پہنچ جائے آخر اس نے ٹوٹنا ہی ٹوٹنا ہے''۔

حضرت مجذوبؒ یوں فرماتے ہیں:

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ، چپکے چپکے، دم بدم
قبر میں میّت اترنی ہے ضرور
جیسی کرنی، ویسی بھرنی ہے ضرور!
کر لے جو کرنا ہے، آخر موت ہے
ایک دن مرنا ہے، آخرت موت ہے!

قرآن مجید میں موت کے اٹل ہونے کا ذکر ایک اور جگہ بڑے زوردار انداز میں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ﴾ (النساء:۷۸)

''تم جہاں کہیں بھی ہو موت تمہیں آ لے گی خواہ تم بڑی ہی مضبوط عمارتوں میں کیوں نہ ہو''۔

مشہور شاعر، فلسفی اور ریاضی دان عمر خیام نے کم و بیش اسی مضمون کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے: (فارسی سے ترجمہ)

''نیشاپور ہو یا بابل!
جام مئے شیریں سے لبریز ہو یا مئے تلخ سے
صہبائے زندگی قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی ہے
برگِ حیات ایک ایک کر کے گرتے رہتے ہیں''

حدیث پاک ہے:

((اَحْبِبْ مَنْ شِئْتَ فَاِنَّکَ مُفَارِقُهٗ))

''جس سے چاہو پیار کرو آخر تم نے اس سے جدا ہونا ہے''۔

بیوی، بیٹے، بیٹیاں، بہن، بھائی، ماں، باپ یا تو انسانوں کے ہاتھوں لحد میں اتر جاتے ہیں اور یا پھر انسان خود اُن کے ہاتھوں سپردِ خاک ہو جاتا ہے اور مال بھی کب کسی کا ساتھ آخر تک دیتا ہے۔ بنگلے، بینک بیلنس، کارخانے، مربعے، باغ اور لشکارے مارتی ہوئی کاریں قبر سے ادھر ہی وارثوں کے لئے (اِلّا ماشاءاللہ) تنازعے، جھگڑے اور مقدمے بازی کا موجب بن جاتے ہیں۔ موت سارے رشتوں کو توڑ دیتی ہے، ساری وابستگیوں کو ختم کر دیتی ہے اور آخر میں اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ ''رہے نام اللہ کا!'' تو پھر کیوں نہ اسی ہمیشہ باقی رہنے والی ذات کے ساتھ پکا سچا تعلق جوڑا جائے، اس کے بلاوے پر جو روزانہ پانچ وقت اذانوں کی صورت میں گونجتا ہے، لبیک کہا جائے اور اپنا سرِ نیاز اس کے در پر خم کیا جائے کہ اسی میں ہماری بھلائی ہے، اسی میں ہماری فلاح ہے، آخرت میں ہی نہیں اس دنیا میں بھی۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک عارف سے کسی نے پوچھا ''کیا یہ سچ ہے کہ نماز پڑھنے سے آخرت میں جنّت حاصل ہو گی؟'' اس نے کہا ''غافل! اگر تو نماز کی اہمیت اور حضورِ قلب سے واقف ہو جائے تو یہ راز تجھ پر منکشف ہو جائے کہ نماز ہی جنّت ہے اور وہ مؤمن کی معراج ہے''۔

آخر میں ایک نہایت ضروری انتباہ ! نماز مؤمن کی معراج تو ہے مگر حضورِ پاک ﷺ کی سنّت کی پیروی میں' اُن صاحب کی اتّباع میں نہیں جنہوں نے کہا تھا ''آپ تو معراج پر تشریف لے گئے' حضوری کا شرف حاصل کیا مگر واپس اسی مادی دنیا میں آ گئے' میں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا' وہیں کا ہو رہتا (اَو کما قال)''۔ مؤمن تو تکبیرِ تحریمہ کہہ کر خدا کے ساتھ سرگوشی کی لذّت سے فیض یاب ہوتا ہے' معراج کے روحانی سفر میں عرش تک چلا جاتا ہے' مگر پھر اپنے پیارے نبی ﷺ کی پیروی میں فرش پر واپس آتا ہے اور واپس آنے کی علامت کے طور پر معاشرے میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر نماز کا اختتام کرتا ہے اور اس طرح دوبارہ معمول کی عائلی' سماجی اور معاشی ذمہ داریوں کو احسن طریقہ سے نبھانا' نیز اس کے علاوہ اقامتِ دین کی اضافی (اور اُمّتِ مسلمہ کی خصوصی) ذمہ داریوں کو سرانجام دینا شروع کر دیتا ہے۔ بدھ مت کے بالکل برعکس اسلام اپنے پیروؤں کو ایسے تارک الدنیا بھکشو نہیں بناتا جو عائلی' معاشرتی اور معاشی ذمہ داریوں سے بھاگیں اور معاشرہ پر بوجھ یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے الفاظ مبارکہ میں عیالا عَلَی المسلمین ہوں۔ آپؓ کے عہد مبارک میں کچھ زیادہ ہی ''متوکّل'' لوگوں نے معاشی جِدّوجُہد ترک کر کے 'نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ '' (ہم تو اللہ پر توکّل کرنے والے ہیں) کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تو آپؓ نے اس غیر اسلامی رجحان کو ختم کرنے کے لئے انہیں کوڑے لگوائے۔ یہ نہایت ضروری تعزیر تھی' کیونکہ یہ لوگ قرآنی احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ سورۃ الجمعہ میں جہاں یہ حکم ہے کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ﴾ (الجمعۃ:۹)

''جب جمعہ کی نماز کے لئے اذان ہو جائے تو خرید و فروخت (اور دوسرے کاروبار) چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف بھاگ کر آؤ''۔

وہاں ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ.....﴾

(الجمعة: ۱۰)

''جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو''۔

انہی معنوں میں حدیثِ مبارکہ ہے:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ)) (رواه البيهقي في شعب الايمان)

''حلال روزی کمانا فرض (نماز) کے بعد فرض ہے''۔

حضور پاک ﷺ نے اپنے ایک محنت کش صحابی کے ان ہاتھوں کو فرطِ محبّت سے چوما تھا جن پر کسبِ حلال کے دوران گٹے پڑ گئے تھے۔ سورۂ مزّمّل میں جہاں ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (آیت ۸) کا حکم ہے اور نصف یا کم وبیش رات کے قیام کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے (آیت ۲، ۳) وہاں کسبِ حلال یا ابتغاءِ فضلِ اللہ کے لئے زمین میں سفر کرنے والوں اور (اقامتِ دین کے لئے) جہاد کرنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ (المزمل: ۲۰) دین و دنیا کا یہ حسین امتزاج' خدا کے ساتھ گہرے اور دائمی تعلق کے ساتھ ساتھ معاشرتی روابط اور ذمہ داریوں کا شدید احساس اور تکمیل اسلامی تعلیمات کا امتیازی پہلو ہے۔ دوسری ثقافتوں میں ایسی کامل اور کثیر الجہات شخصیتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے پیدا کیں اور تا قیامت پیدا کرتا رہے گا۔ دوسری تہذیبوں میں پرورش پانے والے لوگوں کے لئے یہ بڑی اچنبھے کی بات ہے کہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو دنیا کے دروازے کو دین کی چابی سے کھولیں۔ اقبال نے حضور ﷺ کے کارنامے کا یوں تذکرہ کیا تھا کہ ع از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد! بہر حال یہی اسلام کا معجزہ اور نصب العین ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنّت کی تعلیمات پر عمل کر کے دنیا و آخرت میں کامیابیاں حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

●●●

امام ربیع بن صبیح بصریؒ

(م ۱۶۰ھ)

عبدالرشید عراقی

برصغیر (پاک و ہند) میں جن اکابرینِ اسلام نے علم و عمل کی قندیلیں روشن کیں ان میں ایک امام ربیع بن صبیح بصری اور دوسرے اسرائیل بن موسیٰ بصری ہیں۔

امام ربیع بن صبیح کا مُولد و مسکن بصرہ تھا جنہوں نے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض حضرت امام حسن بصریؒ سے کیا۔ ان کے علاوہ امام ربیع نے امام ابن سیرین، امام مجاہد بن جبیر، امام عطاء بن ابی رباح اور امام حُمید الطّویل سے بھی استفادہ کیا۔ (۱)

ان اساتذہ و شیوخ سے استفادہ کے بعد امام ربیع بن صبیح نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تعلّم میں گزرا۔ ان کے مشہور تلامذہ یہ ہیں: امام عبداللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، ابوداؤد طیالسی، سفیان ثوری، عبدالرحمٰن بن مہدی اور ابوالولید الطیالسی (۲)

علم و فضل کے اعتبار سے امام ربیع کا مرتبہ و مقام بہت بلند تھا۔ تمام علوم دینیہ میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ حدیث و فقہ میں جامع الکمالات تھے۔ اس کے علاوہ ثقاہت و عدالت، حفظ و ضبط، امانت و دیانت، تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع میں علمائے اسلام نے ان کے بلند مرتبہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں بیشتر علمائے اسلام کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے امام ربیع بن صبیح کے ثقہ و ثابت ہونے کی شہادت دی ہے۔ ابوزرعہ فرماتے ہیں:

شیخ صالح صدوق

''سچے اور نیک بزرگ تھے''۔

امام شعبہ فرماتے ہیں:

ربیع سید من سادات المسلمین

''امام ربیع مسلمانوں کے پیشواؤں میں سے ایک ہیں''۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

کان عابداً و مجاهداً

''وہ عابد اور مجاہد تھے''۔(۳)

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ:

''ربیع بن صبیح سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں''۔

علم و فضل میں بلند مرتبہ ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت اور زہد و ورع میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے محدث ابن حبان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

''ربیع بصرہ میں سب سے زیادہ عبادت گزار اور صاحب ورع تھے۔ کثرتِ تہجد کی بنا پر ان کا گھر شب میں شہد کی مکھی کا چھتہ بن جاتا تھا''۔(۴)

بصرہ کے پہلے مصنّف

امام ربیع بن صبیح کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ بصرہ کے سب سے پہلے مصنف ہیں۔ صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

هو اول من صنّف فی الاسلام(۵)

''وہ اسلام میں پہلے مصنف ہیں''۔

حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

قال الرامهرمزی اول من صنّف وبوّب بالبصرة الرّبیع بن صبیح ثم سعید بن ابی عروبه و عاصم بن علی (۷)

''رامہرمزی کا قول ہے کہ بصرہ میں جس نے سب سے پہلے تصنیف و تالیف کا کام کیا وہ ربیع بن صبیح ہیں' اس کے بعد سعید بن ابی عروبہ اور عاصم بن علی''۔

صاحب کشف الظنون نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے امام ربیع بن صبیح نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔(۷)

شجاعت و بہادری

شجاعت و بہادری میں بھی امام ربیع بے مثال تھے اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کی شہادت امام شافعی نے دی ہے کہ ربیع بن صبیح بہت بڑے غازی تھے۔ (۸)

خلیفہ عباسی مہدی نے عبدالملک بن شہاب کی قیادت میں ایک فوجی دستہ ہندوستان بھیجا تھا اور اس دستہ میں ایک ہزار مجاہد شامل تھے۔ ان میں ربیع بن صبیح بھی شامل تھے اور ایک خاص دستہ کے افسر اعلیٰ تھے۔ (۹)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں:

''اس جنگ میں ربیع بن صبیح نے اپنے زیر قیادت رضا کاروں میں جہاد کا شوق اور ولولہ پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی جوش اور جذبۂ شہادت کا نتیجہ تھا کہ مجاہدین کے سیل رواں اور ان کے پرجوش حملوں کے سامنے آنے والی طاقت چور چور ہوگئی''۔ (۱۰)

وفات

امام ربیع بن صبیح نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ علامہ ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں:

''جنگ میں بحری راستے سے واپسی کے وقت ۱۶۰ھ میں انتقال کیا اور کسی جزیرہ میں دفن ہوئے۔'' (۱۱)

حواشی

۱) تہذیب التہذیب، ج ۳، ص ۲۴۷
۲) تہذیب التہذیب، ج ۳، ص ۲۴۷
۳) تہذیب التہذیب، ج ۳، ص ۲۴۸
۴) تہذیب التہذیب، ج ۳، ص ۲۴۸
۵) کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۲۳
۶) میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۲۲۴
۷) کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۲۳
۸) کتاب الجرح والتعدیل، ج ۱، ص ۴۲۵
۹) تبع تابعین، ج ۲، ص ۱۷۹
۱۰) تبع تابعین، ج ۲، ص ۱۸۰
۱۱) شذرات الذہب، ج ۱، ص ۳۰۹

●●●

"Whoever retaliates against oppression and is then further persecuted for doing so, will receive the help of God, if he fights the oppressors." (22:60)

So, therefore, on the authority of the Divine Will, it may be concluded that the freedom fighters and the oppressed persons fighting for their rights cannot be labeled as terrorists if they use their secret weapon of causing terror among the oppressors.

Now the question is: What is the solution of world or national terrorism? The only answer is:

(i) The super powers should allow the oppressed nations to live with the same right to liberty, independence, sovereignity and dignity as they want to enjoy for themselves.

(ii) There should be war for peace against every kind of injustice and not for domination.

(iii) There should be no exploitation of any kind by the super powers;

(iv) Prevent the storm of persecution, oppression and cruelties to the poor people;

Otherwise, the declaration of the Supreme Authority is:

"Thus God made them (Pharoahs) a thing of past and made them an example for the future."(42:56, 28:40)

"Neither the heavens wept for them nor did the earth shed tear over them."(4:29)

"God is long of reach. He is swift in chastising and severe in punishment." (40:3)

Let me predict, on the authority of Divine Will, that the Pharoahs of the present days are destined to meet the same tragic end as had been the fate of Pharoahs of past.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

revenge and the attack made by those persons upon the oppressors to seek their remedy certainly causes panic. Sometimes, the desperate persons attack the interest of the powerful nations or the group of persons at the cost of their lives.

The persons who fight for their rights cannot be called to be terrorists when they revolt against the nation who have subjugated them. The Divine Will is :

> "Deal with them so as to strike fear in those who are behind them, so that they may perhaps take a lesson." (8:57)

Now-a-days, there are many ways to cause terrorism and the whole of the world seems to have united to combat the terrorism. But no useful results can be achieved unless the causes are identified and removed, the main cause being injustice. If you:

(i) Squeeze the last drop of blood of the have-nots, they shall scream;

(ii) Suppress the poor nations, they will burst;

(iii) If the west imposes its life style of:

(a) Bisexual (b) Homosexual

(c) Trans-sexual (d) Omnisexual

there shall be a storm of protest among the Muslim nations.

It is imperative, therefore, to solve the conflicts between various regions of the world. Unless the grievance of the aggrieved nations are redressed, terrorism cannot be done away with from the world by bullet. It is unfortunate that so far the world has not been able to define terrorism.

It is generally believed that every group of persons has a right of self-determination of their fate. If this right is denied and the aggrieved persons resort to assert their right, they cannot be called terrorists rather they shall be called freedom fighters and if their struggle is succeeded they become the heroes of their people. They have sanction from Allah Almighty to fight for their rights against the oppressors, The Divine revelation is:

"Since they have been grossly wronged, sanction is given to them to rebel their oppressors." (22:39)
"What ails you that you do not fight in the way of Allah. Feeble men and women are crying "O Allah! rescue us from this Town, the people of which are oppressors. And give us from your presence some protecting friend. O God! send to us from your presence some defenders." (4:75)

It is thus clear that if you deprive a person or group of persons or a nation of his legitimate right and persecute or oppress them, they have a right to fight against the oppressors by all the means they can avail. Surely, the oppressed people cannot face the persecution of the oppressors for lack of sources, arms and material strength. They, therefore, adopt such measures as create panic among rank and file of the oppressors. They, therefore, resort to strike and hide, kill and run. It is a matter of historical record that terrorism has been the effective weapon that the oppressed populations have always employed against the oppressors because it has been the only weapon available to them.

Literally terror means panic and, therefore, terrorism means the state of terror. In general term, terrorism means to create unsafety in the mind of any citizen.

There are number of elements which cause terrorism or there are quite a number of reasons which compel or force a person to resort to the act of terrorism and most important of them is the sense of deprivation of one's right or a sense of denial of justice to a person, group of persons or a nation. The denial of justice to a person causes hatred against the oppressor. Similarly, if a group of powerful persons deprives the poor of their rights, it creates hatred among the poor against them. Similarly, the act of powerful nations to deprive the poor nations of their legitimate rights create discontentment among the poor nations. If the deprived persons are not so powerful to face the oppressors, they always adopt the secret measures to satisfy their

> "To visit any wrong-doer with punishment from above or below or to bewilder him with mal-dissention and make him test of tyranny of one another." (6:65)

Having made everything of the universe to the service of human beings. Allah Almighty commands:

> "God enjoys justice on you who believe, do justice and be steadfast in your evidence and staunch in your judgement as witness for God and do justice even if this might be against your interest or of your parents or nearest kin or on some rich person or some poor person. Do not be governed by personal feelings or desires lest you lapse from the true."(4:135)

The imperative importance of justice has been stated in the Divine Law for the guidance of human beings as under:

> "Let your decision be in accordance with Law revealed by Allah and not in accordance with human desire. Be on your guard that they are not able to make you defy from Divine Law. When they turn away from the Divine Law, it means that Allah intends that they suffer the dire consequences of their own wrong doings; most of them being wrong-doers. They want the matter be decided according to pagan practice; though for those who are firm in faith dispensation as that of God." (5:49)

When there is no justice or the scale of justice is imbalanced, this world becomes under the rule of wrong-doers, oppressors and persecutors. Allah does not like tyranny and oppression. He forbids wrongful oppression and persecution. When the people are oppressed, they have a right to defend themselves. The Divine Will is:

> "Allah forbids wrongful oppression, when believers are oppressed they may defend themselves. Whosoever defends against it, no recourse is open against him. Recourse is open against those who rabble in the land and do wrong to fellow human beings. For such, they will have a painful doom. Persecution is worst than slaughter."(42:41-42)

material universe revolves. It is described in the Holy Quran:

"It is God who has subjected to your service whatever is in the heavens and on the earth. The Sun, the Moon and the stars all are subservient to His command. It is He who has constrained them all to be of service to you." (45:13 & 7:54)

Now let us see what is the law of Nature and Divine commandments. It is described in 5 Ayats of the Holy Quran as :

"The sun and the moon, each float in its own orbit; to the term appointed for it and in the course ordained for it. They have been made punctual and constant, it is not for any one to overtake the other."

(55:5, 21:33, 36:4)

"And the stars and trees humbly submit to His will"

(55:6)

"And He has raised Heaven high and set up measures of gravity to sustain it." (55:7)

Then comes the Divine commandment in mandatory form:

"Do not imbalance the scale of justice." (55:8)

All the units or planets of the universe do not trespass into the orbit of the other nor any one of these units overtakes the other.

If any unit of the universe trespasses into the orbit of other, the whole universe shall be destroyed.

The man being the centre of the universe and the agent or viceroy of Allah Almighty, has also been ordained:

"Not to transgress the scale of justice."

and has been directed:

"Not to make the scale of justice imbalance." (55:9)

So, if the human beings imbalance the scale of justice, there will be disorder in their life and Allah Almighty has created mankind for the sole purpose that they serve the Divine Will and that they should observe equality and justice in their dealings and that they do not imbalance the scale of justice. Allah Almighty is all-powerful:

Allah has put into motion two kinds of law for the purpose of helping man in performance of his duties. They are :

(i) Law of Nature: It is related to man's material progress. The whole of the material universe is invested with the appropriate impetus of this law and is impelled by it. There is no direct revelation concerning this law.

(i) Divine Law : (or Divine commandments of Law of Shariah) It consists of Divine revelation. It comprises rules and principles for the conduct of human beings. The contravention of this law invites Divine displeasures. So, it is only by conformity of this law that man can succeed in fulfilling the purposes for which he has been created and the violation of it arrests his progress towards his objectives.

The whole system of the universe runs on the basis of these laws. Both these laws are made by God and are, therefore, His will, and man has no share in framing them. So long as these two streams continue to runs in parallel channels, the world goes on progressing in peace and man is able to set up a beneficent system of government upon earth. But when these two streams begin to run in opposite directions, or in other words, when human reason is diverted from the course which runs parallel to Divine guidance and is thus deprived of Divine blessing, the world becomes a prey of conflict and disorder. It is then ruled neither according to God's Divine Law nor by man but becomes subject to evil forces because man can claim to be human only so long as he follows Divine guidance, when he ceases to do that he descends to the level of brutes.

Man has been created to illustrate in his own life the attributes of Allah and he is regent of Allah in this world. He is thus the central point of this material universe. In other words man is the sun, around which the whole

Law Relating to Freedom Movements & Terrorism

by
Ch. Muhammad Idrees
Adv. Supreme Court of Pakistan

A conference of advocates of Supreme Court of Pakistan had been held on 30/31.3.2002 at Islamabad under the auspices of Supreme Court Bar Association with the caption "PEACE THROUGH LAW". The delegates from all over the country participated in this conference. A five-member delegation from Sri Nagar, Held-Kashmir also participated in the conference. There had been four sessions in all and specific topics were allotted for each session. First session of 31st March was reserved for "Law Relating to Freedom Movements & Terrorism".

Ch. Muhammad Idrees, Advocate Supreme Court, presented his paper in the first session of 31.3.2002 and received standing ovation and loud applauding. This paper is being presented below.

Law is an undefined term. However, most of the celebrated commentators signify it to be the will of the ruler to regulate the conduct of the citizens of his country. Allah, the Almighty, being the Supreme Ruler, it is, therefore, the will of Allah to regulate the mankind and all other units of universe in performance of their duties.

اسلامی قانون میں ارتداد کے مفہوم' اس کے موجبات اور اثرات ونتائج کو جاننے کے لئے
مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام حال ہی میں شائع ہونے والی نئی کتاب

اسلامی قانون ارتداد

کا مطالعہ کیجئے

مولف

جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

مؤلف نے یہ کتاب اسلامی قانون میں مرتد کی سزا' مالی تصرفات پر پابندی' وصیت ومیراث سے محرومی اور اس کی اولاد کے بارے میں متعلقہ احکام پر مرتب کی ہے۔ ان احکام کو قرآن وحدیث اور چھ اسلامی فقہی مکاتیب (حنفیہ' مالکیہ' شافعیہ' حنبلیہ' ظاہریہ اور شیعہ جعفریہ) کی مستند کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ' رنگین سرورق' صفحات: 116' قیمت: -/48 روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور۔ فون: 03-5869501